مختلف عنوانات کے تحت مرتب کی گئی ہیں، بعض نظموں میں موجودہ قومی و ملی مسائل پر بے لاگ تبصرہ ہے، ایک نظم میں اُردو زبان کے ساتھ جو سیاسی کھیل کھیلا جارہا ہے اس کا ذکر ہے، ایک اور نظم میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی گذشتہ تاریخ اس کی عظمت، خصوصیت، کردار اور ادبی خدمات وغیرہ کو بیان کرکے آخر میں اس کے خلاف اربابِ سیاست اور ملت کے جعفر و صادق کی موجودہ سازش کو بے نقاب کیا ہے، دارالمصنفین کے جشنِ طلائی پر بھی ایک اچھی نظم ہے، "خونِ صد ہزار انجم" کے عنوان سے ملک کے بہیمانہ فسادات کا المناک ذکر ہے، آخری حصہ میں چند مشاہیر ادب و سیاست کے مرثیے ہیں، افضا صاحب کی نظموں میں جدت و طرفگی کے باوجود روایت کی پاسداری بھی ہے، وہ طرزِ ادا اور طریقۂ تعبیر کو شاعری کا ضروری اور اہم عنصر قرار دیتے ہیں اور ترقی پسندی اور جدیدیت نے اردو شاعری کو جو لب و لہجہ دیا ہے اس کو وہ اُردو شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ اور اس کی شعری روایت کے شایانِ شان نہیں سمجھتے ہیں، ان کا کلام موجودہ ماحول کی پستیوں اور بے اعتدالیوں پر مکمل تبصرہ ہونے کے باوجود نعرہ بازی سے خالی ہے، وہ عہدِ حاضر کے پُر آشوب حالات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں کہ نظموں کی روانی اور تازگی میں فرق نہیں آنے دیتے، اُردو کی کلاسیکل شاعری پر ان کی اچھی نظر ہے، فارسی و عربی میں بھی اُنکی استعداد اچھی ہے اس لئے وہ موضوع کے اعتبار سے مناسب الفاظ اور عمدہ پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں، ان کے استعارے، تشبیہیں اور ترکیبیں غریب اور نامانوس نہیں معلوم ہوتیں، کتاب کی طباعت و کتابت بھی عمدہ ہے اس لئے یہ معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری حسن و نفاست سے بھی آراستہ ہے، ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہو چکی ہے، امید کہ اور بھی زیادہ ہوگی جس کی یہ مستحق ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۵ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۰ء عدد ۶

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

گذشتہ اپریل کے معارف کے شذرات میں ذکر آیا تھا کہ چودہ سو سال کے اندر مسلمانوں نے دنیا کو کیا کیا چیزیں دیں، اس وقت اس کا جائزہ لینا ہے کہ مسلمان اس برصغیر میں آکر آباد ہوئے تو اسلام اور اُن کے اثرات کا اظہار کس کس طرح ہوا،

ـــــ • ـــــ

ان اثرات کا ذکر پہلے ہم ہندو مورخوں ہی کی زبانی بیان کرنا پسند کریں گے، جناب ان۔ سی۔ مہتا انگریزوں کی حکومت کے عہد کے بہت مشہور آئی۔ سی۔ ایس تھے، انھوں نے اپنے ایک مضمون "ہندوستانی تہذیب در اسلام" میں لکھا تھا کہ اسلام تخیل کی کوئی جدت نہیں بلکہ اس کے لئے باعث فخر یہ بات ہے کہ اُس نے اپنے سے پہلے کی پیش کردہ خیالات کو لوگوں کے دلوں میں اتار کر ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کردیا، توحید کا مسئلہ اہل ہند کے لئے نیا نہ تھا لیکن یہاں بت پرستی انتہا تک پہنچ گئی تھی، اسلام ہمیشہ بت پرستی، باطل توہمات، اور مذہب کی شکل میں چھپی ہوئی بربریت کو گوارا کرنے سے منکر رہا، اس نے ہندوستان میں کوئی نئی قوم لاکر آباد نہیں کیا، ہم یہاں صرف ایک نورانی مشعل لایا جس نے اس وقت جب کہ پرانے تمدن انحطاط پذیر ہو رہے تھے، اور پاکیزہ مقاصد محض ذہنی معتقدات بن کر رہ گئے تھے، انسانی زندگی کو چھائی ہوئی ظلمتوں سے پاک کردیا،

ـــــ • ـــــ

ان۔ سی۔ مہتا نے یہ بھی لکھا کہ اگر پورا ہندوستان نئے دین کے دائرے میں داخل ہو جاتا تو یہ یقینی امر ہے کہ اچھوتوں کا مسئلہ حل ہو جاتا، چھوت چھات جو سوامی دیویکانند کے قول کے بموجب ہندو مت کی مخصوص شان ہوگئی ہے، مٹ گئی ہوتی، اسلام کا اصولی اعتقاد یہ ہے کہ معاشرتی اور مذہبی امور میں مسلمان بلا لحاظ قومیت و حرمت کامل مساوات رکھتے ہیں، بنیادی اصول ہندو تمدن کے لئے بالکل نئی چیز تھی، اسلام کی فتح یہ تھی کہ پست اقوام نے اس میں بخوشی داخل ہونا شروع کیا، جن کو اس مذہب کے قبول کرنے کو جو اپنے لئے ایک نعمت

مستقبل نظر آیا، اس سے سب سے زیادہ صدمہ کثیر التعداد معبودوں کی پرستش کو پہنچا! اسلام ہی کی وجہ سے نیچے طبقہ کے لوگوں میں یہ احساس ہوا کہ عمل صالح اور جذبہ صادق کی بدولت وہ بھی اعلیٰ سے اعلیٰ شرفاء کے ہمسر ہو سکتے ہیں، چنانچہ ان میں بھگتی مذہب اسلام ہی کے سبب مقبول ہوا، اسلام ہندو سماج کے وجود اور اس کی قدیم تنظیم کے لئے ایک چیلنج بن گیا، تو اس کو اپنے اندر تبدیلیاں کرنی پڑیں، آریہ سماج کی تحریک اسلام کی طبعی قوت کی رہین منت ہے، اسلام کی توحید کا اثر جین مذہب نے بھی قبول کیا، اور اس کے ماننے والوں نے اپنے عقائد کی تشکیل از سر نو کی،

ـــــ • ـــــ

کے۔ ام۔ پنیکر اپنے زمانہ کے بہت مشہور مورخ تھے، وہ اپنی کتاب اے سروے آف انڈیا میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام آیا تو اس نے مذہب پر فخر کرنا سکھایا، اور ایک ایسا قانونی نظام عطا کیا جو کئی لحاظ سے اس زمانہ کے قوانین سے ترقی یافتہ تھا، راجپوتانہ اور وجیا نگر کے ہندو راجا اسلام ہی کے اثر سے اپنے دھرم اور مذہب کے علم بردار بن گئے، قدیم زمانے میں شمال میں بھار شنوا ور گپت اور جنوب میں پلو اور چول خاندانوں کے راجا پکے ہندو ضرور رہے، لیکن مذہب کی حمایت اور مدافعت کا خیال اُن کے دلوں میں کبھی نہیں آیا، اسلام سے ان کا واسطہ پڑا تو وہ بھی اُن کے حامی بن گئے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوؤں میں خدا پرستی کا تصور اسلام کی بدولت پیدا ہوا، ہندو پیشواؤں نے اپنے دیوتاؤں کا نام خواہ جو بھی رکھا ہو، اسلام ہی کے اثر سے انھوں نے خدا پرستی کی تعلیم دینی شروع کی یعنی خدا ایک ہے، وہی عبادت کے لائق ہے، اسی کے ذریعہ نجات مل سکتی ہے،

ـــــ • ـــــ

ڈاکٹر تارا چند نے "اسلام کا اثر ہندوستان پر" کے عنوان سے ایک پوری کتاب ہی لکھ دی ہے اس میں ایک جگہ وہ مطراز ہیں کہ مسلمان ہندوستان آئے تو ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو ادب اور ہندو سائنس نے اسلامی اثرات قبول کرنے شروع کئے، مہاراشٹر، گجرات، پنجاب، ہندوستان اور بنگال کے مذہبی پیشواؤں نے پرانے اعتقادات کی بہت سی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، مسلمانوں کے اثر سے نہ صرف

ہندوستان کی اقتصادی زندگی، بلکہ یہاں کی معاشرت اور سیاست میں بھی کافی انقلابات پیدا ہوئے مسلمانوں میں خاندان ونسل کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے، اس سے ہندو بھی متاثر ہوئے، انھوں نے اپنی معاشرتی بندشوں کو توڑ کر معاشرتی مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی، یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کے اثرات پڑے، یہ اثرات رسم ورواج گھریلو زندگی، موسیقی، پوشاک، لباس، کھانے پکانے کے طریقوں، شادی بیاہ کے مراسم، تہواروں، میلوں اور مرہٹہ راجپوت اور سکھ والیان ریاست کے درباروں کے آداب میں زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، بابر کے زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں اس طرح ملے جلے رہتے تھے کہ بابر مسلمانوں کے ہندوستانی طرز زندگی کو دیکھ کر متعجب ہوگیا تھا، اس کے جانشینوں نے اس طرز زندگی کو اس شاندار طریقہ پر آراستہ وپیراستہ کیا کہ انھوں نے اپنے بعد جو کچھ چھوڑا، اس پر ہندوستان بجا طور پر فخر وناز کرسکتا ہے،

جدوناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے جب کشمیر سے اراکان اور غزنین سے چاٹگام تک کے علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کیا، تو ہندوستان میں پہلی دفعہ جغرافیائی وحدت قائم ہوئی، جو اس سے پہلے اس کو کبھی بھی نہیں حاصل ہوئی تھی، جدوناتھ سرکار نے جب اپنا ایک مضمون "ہندوستان میں اسلام" کے عنوان سے لکھا تو اس میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے عہد میں ہندوستان کو حسب ذیل چیزیں دیں (۱) انھوں نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس سے بحری جہازوں اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا، ہندوستان میں چولا کی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ دونوں چیزیں بالکل ختم ہوگئی تھیں (۲) ہندوستان کے بیشتر علاقوں خصوصاً وندھیاچل کے شمال میں اندرونی طور پر امن وسکون قائم ہوا (۳) ایک قسم کے نظام حکومت سے ....

پورے ملک کو یکسانیت حاصل ہوئی (۴) مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگوں کے عادات واطوار اور لباس وغیرہ معاشرتی امور میں یکرنگی آئی (۵) ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ وجود میں آیا، جس میں ہندوؤں اور چینیوں کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، تعمیرات میں ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا، شال، کمخواب قالین اور ترصیع کاری، اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں (۶) ایک مشترکہ زبان، ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی، نثر نویسی میں ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا، جس کی بنا ان ہندوؤں نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے، اس اسٹائل کو مرہٹوں نے اپنی زبان میں بھی رائج کیا (۷) دہلی کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی، تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی (۸) مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی، اور تصوف پھیلا (۹) تاریخی لٹریچر پیدا ہوا، کاغذ یہاں مسلمانوں ہی نے رائج کیا (۱۰) فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا، مصوری میں ایک خاص اسکول قائم ہوا، ہندوستان میں باغبانی کے ذوق کا رواج ہوا،

ڈاکٹر بینی پرشاد نے اپنی کتاب "ہسٹری آف جہانگیر" میں لکھا ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں پہلی دفعہ اسٹیٹ پولیس اسٹیٹ سے کلچر اسٹیٹ میں تبدیل ہوئی، رام پرشاد کھوسلا نے اپنی کتاب مغل کنگ شپ اور نوبیلیٹی میں اعتراف کیا ہے کہ مغل بادشاہوں نے ایک پائدار نظام حکومت قائم کرکے پورے ملک کو ابتری اور بدحالی سے بچا لیا، ڈاکٹر پی سرن رقمطراز ہیں کہ مغلوں نے اپنے بعد ایک بہت ہی قیمتی سیاسی وراثت چھوڑی ہے، اور یہ تو تمام مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ اکبر کے زمانہ میں جو زمین کی پیمایش ہوئی اور اس کی جو تفصیلات آئین اکبری میں درج ہیں انہی کو بنیاد بنا کر انگریزوں نے ہندوستان کے اندر لینڈ رفارم کیا،

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اکبر آباد، فتح پور سیکری، شاہجہاں آباد، الہ آباد، فتح پور، فتح آباد، شکوہ آباد، فیروز آباد، علی گڑھ، شاہجہاں پور، مراد آباد، ابراہیم آباد، دولت آباد، حیدر آباد، احمد آباد، احمد نگر، اورنگ آباد، عظیم آباد، بوگرا، برہان پور، اور مصطفٰی آباد وغیرہ جیسے مشہور شہروں کو مسلمانوں ہی نے آباد کیا، ایسے قصبوں اور دیہاتوں کے تو ان گنت نام ہیں جو اُن کی وجہ سے آباد ہوئے،

ملک میں وحدت قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کے زمانہ میں بے شمار سڑکوں کی بھی تعمیر ہوئی، بنگال سے لاہور، لاہور سے پشاور، اٹک سے کابل، آگرہ سے قنوج، لکھنؤ سے اجودھیا، فیض آباد ہو کر جونپور، لاہور سے شاہدرہ، تلونڈی، راجاوری وغیرہ سے ہو کر کشمیر، سورت سے برہان پور، گوالیار ہو کر آگرہ، اور پھر سورت ہی سے بھروچ، بڑودہ، احمد آباد، اجمیر اور بیانہ ہو کر اکبر آباد تک کی یہ ساری سڑکیں مسلمانوں کے زمانہ میں بنائی گئیں، جو اب تک ہیں، اُن کے اوپر بڑے بڑے پل بھی تعمیر ہوئے، سنگ میل بھی نصب کئے گئے، سایہ دار درخت بھی لگوائے گئے، جا بجا سرائیں بھی قائم کی گئیں، مغلوں نے شاہراہوں کی تعمیر میں جو دلچسپی لی، اس کی تعریف پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی ڈسکوری آف انڈیا میں بھی کی ہے،

تاج محل کو دیکھ کر آج بھی بیرونی سیاحوں کی نگاہیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، اور وہ ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی عروج کے قائل ہوتے ہیں، تعمیرات میں ہشت پہلو، دندانہ دار، پیالہ دار، ذکدار محرابیں، محراب دار چھتیں، شلجم نما گنبد، مثمن برج، ابھرواں نقاشی، مینا کاری، استرکاری، کاشی کاری، ٹائیل، موزیک، جوڑائی کے مضبوط مسالے، سنگ مرمر پر اعلیٰ پچی کاری، بلند پھاٹک اور اس کے اوپر برجیاں، گنبد، اور پہرہ داروں کے سکونتی مکانات، لکڑی کے بڑے بڑے دروازے، محل اور مکانات کے اندر بڑے بڑے صحن، شہ نشین، بارہ دری، چمن آرائی، اور

فوارے وغیرہ مسلمانوں کی وجہ سے یہاں رائج ہوئے، پھر ان میں شوکت، تناسب اور توازن کے ساتھ انتہا درجہ کی لطافت، نفاست اور نزاکت انہی کی وجہ سے پیدا ہوئی،

ہندوستان میں پارچہ بافی کے سلسلہ میں مخمل، طاس، مشجر، دیبا، اطلس، خارا، قطنی، تافتہ، مشروع، گلبدن، سنگی، خاصہ، چوتار، ململ، سری صاف، ڈوریہ، سر گل، آب رواں، تنزیب، جامدانی، شال، اور پشمینے وغیرہ مسلمانوں ہی کی وجہ سے یہاں رواج پذیر ہوئے، کامدانی اور زردوزی کی صنعت کو ان کی وجہ سے بڑا فروغ ہوا،

پارچہ بافی اور دوسری چیزوں میں آبنوسی، آبی، آتشی، ارغوانی، اخضری، حنائی، خاکی، زنگاری، زعفرانی، زیتونی، زمردی، سیمابی، اسودی، شنگرفی، طاؤسی، طباشیری، عنبری، عنابی، کاکریزی، کبودی، کاسنی، اور باقی رنگوں کا اضافہ ان ہی کی وجہ سے ہوا،

خوشبوئیات میں گلگنگ، روح افزا، زباد، مید، ملاگیرا ور اطفار الطیب وغیرہ مسلمان اپنے ساتھ لائے، پھولوں میں یہاں بنفشہ، یاسمین اور نسترن کا رواج ان ہی کی وجہ سے ہوا، مغلوں نے خیابان ہندی، طرح ادائی اور چمن آرائی کے ذریعہ فن باغبانی میں جس خوش مذاقی اور حسن سلیقگی کا ثبوت دیا، وہ انگریز بھی اپنی حکومت کے زمانہ میں نہ دیکھے، اسی لئے وہ اپنے لگائے ہوئے خوبصورت باغ کو مغل گارڈن کہہ کر تسکین دے لیا کرتے تھے، یہاں درختوں میں پیوند لگا کر اچھے درخت پیدا کرنے کا رواج مسلمانوں ہی نے دیا، قلمی آموں کی بے شمار قسمیں ان ہی کی وجہ سے پیدا ہوئیں، انگور، انار، زرد آلو، شفتالو، آلوچہ، خربزہ، تربوز، بادام، اور پستہ مسلمان ہی ہندوستان لائے،

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے چاول کی پکی ہوئی قسموں میں صرف بھات، کھیر اور کھچڑی تھیں، مگر اُن کی وجہ سے چاول کے پکانے میں طرح طرح کی قسمیں تیار ہونے لگیں، مثلاً قبولی، قیمہ پلاؤ، کوکو پلاؤ، موتی پلاؤ، نورتن پلاؤ، نرگسی پلاؤ، انگوری پلاؤ، فالسی پلاؤ، مچھلی پلاؤ، متنجن، زردہ، اور مزعفر وغیرہ روٹیوں میں باقر خانی، کلچہ، تافتان اور شیرمال، ان ہی کے جدتِ ذہن کے نتائج ہیں، گوشت کی قسموں میں قورمہ، شامی کباب، گولہ کباب، نرگسی کباب، سیخ کباب، کوفتے اور پسندے وغیرہ ان ہی کے دسترخوان کی یادگاریں ہیں، جلیبی، برفی، قلاقند، گلاب جامن، بالوشاہی، گوجھی، پیاؤ برے، امجوبلی، فیرنی، مربے، اور طرح طرح کے حلوہ جات اُنہی کی ایجادات ہیں،

———— : ————

یہ تو ایک بہت ہی مختصر جائزہ ہے، اسی سے اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کی کن کن نعمتوں کو موجودہ ہندوستان جھٹلائے گا، انھوں نے ہندوستان کو جنت نشان بنایا، اور سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہی کو قرار دیا، مگر اب اُن کی کیا حیثیت بنادی گئی ہے، ان کا نام اچھوتوں کے ساتھ لیا جاتا ہے، اور ترحم خسروانہ سے اعلان ہوتا رہتا ہے، کہ مسلمانوں، اچھوتوں اور پچھڑی جاتیوں کے حقوق اور تحفظ کا پورا خیال رکھا جائے گا، گویا مسلمانوں کا شمار ہندوستان کے اچھوتوں اور پچھڑی جاتیوں کے ساتھ ہے، فاعتبروا یا اولی الابصار،

جناب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی رحلت کی خبر دارالمصنفین میں بہت ہی رنج والم کے ساتھ سنی گئی، مرحوم قوم وملت دونوں کے لئے بہت مخلصانہ جذبات رکھتے تھے وہ ایک اچھے خدمت گذارِ ملت کے ساتھ ہی بڑے سچے محبِ وطن بھی تھے انھوں نے اپنی سرگرمیوں سے یہ عملی نمونہ پیش کیا کہ ایک سچا مسلمان ہی سچا محب وطن ہو سکتا ہے قاضی صاحب نے اردو، علی گڑھ اور مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ مدت مدید تک یاد رہیں گی، ان پر تفصیلی مضمون معارف کی آیندہ اشاعت میں شائع ہوگا،

مقالات

صلیبی جنگ اور اُس کے اہم پہلو

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

سیاسی اثرات یورپ کی مغربی ریاستوں نے جنگ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے آخر میں "صلاح الدین ٹیکس" کے نام سے ایک ٹیکس وصول کرنا شروع کیا تھا، جس سے ان کی دولت میں نہ صرف اضافہ ہوا، بلکہ ان کو نئے ٹیکس لگانے کا اختیار بھی حاصل ہوگیا، اب تک ان کو زمین کی پیداوار ہی پر ٹیکس لگانے کا حق تھا، اس حق سے فرانس نے زیادہ فائدہ اٹھایا، اور چونکہ فرانس نے ان لڑائیوں میں زیادہ حصہ لیا تھا، اس لئے اس کو ان سے فوائد بھی زیادہ پہونچے، شام میں اس کی نوآبادیاں زیادہ قائم ہوئی تھیں، اور یورپ میں دوسرے ممالک کے مقابلہ میں اس کے وقار میں زیادہ اضافہ ہوا (تفصیل کے لئے دیکھو مضمون کروسیڈ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج ۶، ص ۷۴۳ گیارہواں ایڈیشن)

ان لڑائیوں کی وجہ سے جرمنی کی سیاست بھی ایسی الجھی کہ اس کے سلجھنے میں بڑی دیر لگی، لیتھونیا کے ٹاؤٹن کی شرکت کی وجہ سے پروشیا کی سیاست بھی ایسی بدلی کہ اس کے لئے جدید پروشیا کی بنیاد پڑی، (کروسیڈ از بیر اینڈ گنگسفور ڈ باب ۲۰)

ان لڑائیوں کا سب سے زیادہ اثر بازنطینی سلطنت پر پڑا، (اس کی سرحد یورپ میں دریائے ڈینوب اور ایشیا میں اناطولیہ اور شام تک پھیلی ہوئی تھی، قسطنطنیہ نہ صرف اس سلطنت بلکہ یورپ کا حصنِ حصین تھا، اس کو مسلمان فتح نہ کر سکے تھے، مگر جب چوتھی صلیبی جنگ کے سلسلہ میں صلیبیوں نے اس کو لوٹ کر برباد کر دیا اور وہاں فلانڈرس کا رئیس شہنشاہ بنا دیا گیا تو قدیم شہنشاہی کی طرح یہ شہنشاہی قوی ثابت نہیں ہوئی، یہ تباہ ہوگئی تو یونانی شہنشاہی قائم ہوئی، مگر اس کو بھی سابقہ قوت کبھی حاصل نہیں ہوئی، اور وہ کمزور ہوتی گئی، (تاریخ یورپ از اے، جے گرانٹ ص ۳۶۲)

جب دولت عثمانیہ ابھری تو وہ اس بازنطینی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس سے برسرپیکار رہی، عثمان خاں اول نے تو اس کے اہم قلعے فتح کر کے اپنی فتوحات کا دائرہ بحر اسود تک پہنچا دیا، پھر ایشیائے کوچک میں اس کے شہر بروصہ کو بھی حاصل کر لیا، عثمان خاں کے بیٹے اورخان نے گیلی پولی پر قبضہ کر کے مسیحی یورپ میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے ویانا کی دیواروں تک پھیل گئی، بازنطینی حکومت کا قیصر کنٹا کوزین تو اتنا اس کے سامنے جھکا کہ اس نے اپنی بیٹی تھیوڈرا کو خان کے حبالۂ عقد میں دے دیا، اس وقت اس کے تمام ایشیائی مقبوضات پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا، قسطنطنیہ کے علاوہ صرف تھریس، مقدونیہ اور موریا کے کچھ حصے اس کی سلطنت میں رہ گئے تھے، اور خان کے جانشین مراد اول کے زمانہ میں دولت عثمانیہ کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر مسیحی حکومتیں صلیبی جنگ کے زمانہ کی طرح اس کے خلاف صف آرا ہوئیں، مگر کسووا کی جنگ میں ہلال کو صلیب پر فتح ہوئی، اور جب مراد اول مرا تو یورپ میں بلغاریہ، سرویہ اور بوسینا پر اس کا تسلط تھا،

مراد کے جانشین بایزید اول یلدرم کی طاقت اور بڑھی تو سرویا کے بادشاہ نے اپنی بہن شہزادی ڈیسپینا کو اس کے نکاح میں دے دیا، اس نے اپنی بڑھتی ہوئی طاقت سے فائدہ اٹھا کر

قسطنطنیہ میں بہت سی رعایتیں حاصل کر کے اس کے آخری قلعہ فلاڈلفیا پر بھی قبضہ کر لیا، ولاچیا اور بلغاریہ بھی اس کے زیر نگیں ہو گئے، اناطولیہ اور ایشیائے کوچک کے اکثر علاقے اس کی حکومت میں شامل ہو گئے اور جب یورپ میں اس نے نائکوپولس، ویدین اور سلسٹریا کو بھی فتح کر لیا تو یورپ نے اس کے خلاف ایک صلیبی جنگ کا اعلان کیا اور فرانس اور جرمنی، بویریا اور برگنڈی وغیرہ کو ابھار کر ایک صلیبی فوج اس لئے تیار کی گئی کہ بایزید یلدرم کو شکست دے کر یہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے، پھر یہ درۂ دانیال کو عبور کر کے شام میں داخل ہو، اور ارض مقدس پر قبضہ کر کے یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کر کے انتقام لے (ہسٹری آف دی اوٹومن ٹرکس از اڈورڈ کریسی ص ۵۲، ج ۱) پھر ایک بار یورپ میں صلیبی جنگ کی فضا قائم ہو گئی، بڑی خونریزی ہوئی، مگر ہلال صلیب پر غالب آیا، اس کے بعد بایزید نے یونان کو بھی فتح کر لیا، اور جب وہ قسطنطنیہ کی تسخیر کے لئے اس کے محاصرہ میں مشغول تھا تو تیمور اپنے جرار اور سفاک لشکر کے ساتھ اس کے قلمرو پر حملہ آور ہوا، اور اس کو شکست فاش دے کر اس کے تمام کارناموں پر پانی پھیر دیا، تیمور نے اس کو قید کر لیا، اور اسی قید میں اس کی موت ہوئی، اس کی اس شکست پر یورپ میں بڑی خوشی منائی گئی، اور بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ دولت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا، لیکن محمد اول نے دولت عثمانیہ میں از سر نو جان پیدا کی، اس کے جانشین مراد ثانی کے عہد میں اس کی قوت اتنی بڑھی کہ اس نے نہ صرف قسطنطنیہ سے ٹکر لی، بلکہ سالونیکا اور سرویا پر بھی قبضہ کر لیا، مسیحی حکومتیں مل کر اس کے خلاف بیس برس تک جنگ کرتی رہیں، ان مختلف معرکہ آرائیوں میں صلیبی جنگ کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ان صلیبیوں کو وارنا کی جنگ میں شکست ہوئی، مراد ثانی کے جانشین محمد کے زمانہ میں ترکوں کی قوت اتنی بڑھی کہ اس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کر لیا، جس کے بعد بازنطینی امپائر کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد جس طرح قسطنطنیہ میں داخل ہوا ہے، اس کا ذکر لارڈ ایورسلے نے اپنی کتاب ٹرکش امپائر میں اس طرح کیا ہے، "اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کئے، اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فتحِ قسطنطنیہ کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا، جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھیں، جب کہ محاربین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہو پائی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی، اور وہ اس میں کامیاب رہا، (ص ۸، بحوالۂ دولت عثمانیہ ج ۱ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڈھ ص ۱۱۵) پروفیسر آرنلڈ نے بھی اپنی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام" میں لکھا ہے کہ قسطنطنیہ کے عیسائیوں نے اطاعت قبول کر لی تو وہاں کے کلیسا کے بطریق کو یہ رعایتیں دی گئیں کہ وہ شہر میں جلوس کے ساتھ نکل سکتے ہیں، وہ اپنی عدالت میں اپنے مقدمے خود فیصلے کر سکتے ہیں، اپنے مجرموں کو موت کی سزا بھی دے سکتے ہیں، وہ اپنی عیسوی فقہ پر عمل کر سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، لارڈ ایورسلے محمد کی اس رواداری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ محمد کی عظیم الشان رواداری یورپین حکومت کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہل اسپین نے ان مسلمان مورس کو جنھوں نے اپنے گرفتار کرنے والوں یعنی عیسائیوں کا مذہب اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کو ملک سے نکالتے وقت یہ نمونہ پیش نہیں کیا، یونانیوں یا قسطنطنیہ کے دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، (ٹرکش امپائر　لارڈ ایورسلے ص ۸۹)

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر آرچر اور کنگسفورڈ نے تبصرہ کرتے ہوئے اجمالی طور پر لکھا ہے کہ پہلی جنگ صلیبی کی وجہ سے رومن امپائر سلجوقیوں کے زیر نگیں ہونے سے بچ گیا تھا،

آخر بارہویں صدی میں اس امپائر کے بہت سے کھوئے ہوئے علاقے واپس مل گئے تھے، لیکن بعد میں صلیبی فوج جس منتشر طریقے سے جنگ کے لئے روانہ ہوئی اس سے اس امپائر کو بڑا نقصان پہونچا، اس کے زوال کو صلیبی جنگ سے منسوب کیا جا سکتا ہے، (ص ۴۴)

یہی مصنفین لکھتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کی طاقت مشرقی یورپ میں یونانی امپائر کے زوال سے بڑھتی گئی، چودہویں صدی کے آخر میں بایزید نے بلغاریہ اور سرویہ کو زیر کیا، پھر ہنگری خطرہ میں پڑ گیا، جس سے مغربی یورپ کے سورما عیسائیت کے مشترکہ دشمن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور فرانس کے نائٹون کی ایک بڑی جماعت ترکوں سے برسرپیکار ہوئی، مگر شکست کھا گئی، اس وقت بایزید قسطنطنیہ کو فتح نہ کر سکا، لیکن اس میں عیسائیوں کے شجاعانہ کارناموں کا کوئی دخل نہیں، تیمور کا حملہ حائل ہوا، پھر بایزید کے لڑکوں میں خانہ جنگی بپا رہی، جس سے قسطنطنیہ کچھ دنوں اور محفوظ رہا، لیکن ۱۴۵۳ء میں جب محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو پوپ نے مغربی یورپ کو ایک صلیبی جنگ کے فرائض ادا کرنے پر پھر ابھارا، لیکن دو صدیوں تک ترک مشرقی یورپ پر طوفانی بادل کی طرح چھائے رہے، جب ۱۵۷۱ء میں لیپانٹو اور ۱۶۸۳ء میں ویانا میں ترکوں کو جو شکست ہوئی تو یہ یقیناً صلیب کی فتح تھی، مگر چودھویں صدی سے انیسویں صدی تک ترکوں کے خلاف جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں مقدس جنگ کا رنگ نہیں رہا، (کروسیڈ ص ۴۲۱ - ۴۲۰)

ان لڑائیوں میں بیت المقدس کی صلیبی لڑائیوں کا مذہبی جنون نہ رہا ہو، مگر فرانسیسی مؤرخ موسیو لیبان نے اعتراف کیا ہے کہ جنگ صلیبی نے کئی صدیوں تک دنیا میں شدید مذہبی عداوت اور ناروا داری جاری رکھی، اور اس کو بے رحمی اور خونخواری کے درجہ تک پہنچا دیا، جس کی مثال مذہب یہود کے سوا کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی (تمدن عرب ص ۳۰۶)

یہ مذہبی عداوت، نارواداری، بے رحمی اور خونخواری صدیوں تک کس کے خلاف رہی، یقیناً مسلمانوں کے خلاف، عیسائی سسلی اور اسپین کے مسلمانوں کا خون چوسنے کے بعد مطمئن نہیں ہوئے، تو ٹرکش امپائر کے مسلمانوں کا گلا گھونٹنے کے لئے برابر متحد کوشش کرتے رہے اور اس میں وہ کامیاب رہے، انھوں نے صدیوں کی کوششوں کے بعد پہلی جنگ عظیم کے بعد ٹرکش امپائر کا تیا پانچہ کر دیا، کس طرح؟ اس کی ایک جھلک یورپ کے مشہور مورخ ٹوائن بی کی حسب ذیل تحریر میں دکھائی دے گی، سمرنا میں جب یونانی فوج داخل ہوئی تو ٹوائن بی لکھتا ہے، ۱۵، رمئی سنہ ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوگئی، جیسے کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا، جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے کے بعد ایک روز دفعۃً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہو گیا، محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے، عقبی خطہ کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں، ایک فوجی دیوار کھڑی ہو گئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کے بندرگاہوں کو اندرون ملک سے جدا کرکے تجارت کو تباہ کر دیا، لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سرنگیں مسمار کر دی گئیں، ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتار دئے گئے، اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لئے گئے یا جلاوطن کر دئے گئے، غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا، (بحوالہ دولت عثمانیہ ج ۱، ص ۳۴۸، شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ)

کیا یہ سفاکی، خونریزی اور ہولناکی صلیبی جنگ کی یاد تازہ نہیں کر رہی تھی،

کلیسا پر اثرات | اب تک صلیبی لڑائیوں کے جو فوری اور دوررس سیاسی اثرات مرتب ہوئے، اس پر روشنی ڈالی جا رہی تھی اب ذرا یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان لڑائیوں سے کلیساؤں نے

کیا کیا فوائد اٹھائے، یہ لڑائیاں پوپ ہی کے اشتعال دلانے پر چھیڑی گئیں، اس کی ہر آواز پر یورپ آمنا و صدقنا کہتا رہا، صلیبی فوجیں اسی کے حکم کی تعمیل میں روانہ ہوتی رہیں، صلیبیوں کی فوج اسی کی فوج سمجھی جاتی، اس سے پاپائی طاقت میں اتنا اضافہ ہوا کہ یورپ کے حکمراں اس سے خوفزدہ رہنے لگے، پوپ کی طاقت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ فرانس کا بادشاہ سینٹ لوئی اپنے ملک فرانس میں تو مقبول رہا، مگر پوپ اس سے پانچویں جنگ صلیبی میں خفا ہوا، تو اس کو اور اس کے قلمرو نیپلز کو کلیسا کے دائرۂ اثر سے خارج کر دیا، فریڈرک اور پوپ دونوں کے جانشینوں میں سخت اختلاف رہا، فریڈرک نے تو یہ آواز بلند کی کہ زمانہ کی ساری خرابیاں اہل کلیسا کے غرور اور دولت کی وجہ سے ہیں، اس کی اس رائے سے یورپ کے اور حکمراں بھی متاثر ہوئے، (آوٹ لائن آف ہسٹری، از، ایچ، جی، ویلس ص ۶۶۰)

کلیساؤں کے غرور کی وجہ یہ بھی تھی کہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں وہ یورپ کے ہر ملک کی سیاست میں بھی اثر انداز ہونے لگے تھے، مغربی یورپ کے ہر ملک کے کلیسائی نظام میں پوپ مقتدر اعلیٰ قرار دے دیا گیا تھا، اس کے احکام کو حکومت بھی تسلیم کرنے لگی، جس سے آگے چل کر حکومت اور کلیسا میں بڑی آویزش ہوتی گئی،

صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں اہل کلیسا کا اثر اس لحاظ سے بھی بڑھا کہ جو لوگ صلیبی جنگ میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہوتے تو وہ ان ہی کے حکم کے پابند رہتے، اور جو صلیبی جنگ میں جانے کا وعدہ کر کے اس میں شرکت کرنے سے گریز کرتے تو ان کے معتوب ہو جاتے۔

ان کلیساؤں کو ان لڑائیوں کے زمانہ میں متمول ہونے کا بھی موقع ملا، پوپ نے

تو "صلاح الدین ٹیکس" کی طرح عشر بھی عاید کر رکھا تھا، صلیبیوں کے پاس جنگ میں شریک ہونے کے لئے سرمایہ نہ ہوتا تو وہ اپنی زمین، جائداد اور اثاثہ فروخت کر دیتے، ان کو زیادہ تر کلیسا کی طرف سے خرید لیا جاتا یا خود پادری انفرادی طور پر خرید لیتے، جو لوگ بوڑھے، یا جنگ میں شریک ہونے سے معذور ہوتے تو وہ شرکت سے بچنے کی خاطر اپنا اثاثہ کلیسا کے حوالے کر دیتے۔ اس طرح کلیسا اور پادریوں کے پاس بڑی دولت جمع ہوگئی، جس زمین اور جائداد پر ان کا قبضہ ہو جاتا وہ برابر ان ہی کے پاس رہتی، ان کی بڑھتی ہوئی دولت کا ردعمل بھی ہوا اور کلیسائی نظام میں ریفارمیشن کی جو تحریک چلی اس میں ان کلیساؤں کا متمول ہونا بھی تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہب کو ان لڑائیوں میں جس طرح استعمال کیا گیا، مفاد پرستوں کی وجہ سے ان میں جو ناکامیاں اور ہولناکیاں ہوئیں، اس سے بھی ایک طبقہ میں بڑا تکدر پیدا ہوا، جس سے بھی یورپ کے ریفارمیشن کی تحریک میں بڑی مدد ملی، (مزید تفصیل کے لئے دیکھو کریڈ از آر جے اینڈ کنگسفورڈ ص ۳۴۴-۴۳۲ اور تمدن عرب از موسیو لیبان، ص ۳۰۸-۳۰۷)

تجارتی و اقتصادی اثرات پہلے ذکر آچکا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یورپ کے تاجروں کو مشرق میں ایک تجارتی منڈی مل جائے، جو ان لڑائیوں کی وجہ سے ان کو مل گئی، گرانٹ لکھتا ہے کہ شمالی اطالیہ کی تجارتی سلطنتوں نے صلیبی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا، اس سے انھوں نے بہت سے مالی فوائد حاصل کئے، مشرق کے تمام بڑے بڑے بندرگاہوں میں انھوں نے تجارتی حقوق پیدا کر لئے، اس طرح قسطنطنیہ کی تجارت وینس اور جنیوا کے بندرگاہوں میں منتقل ہوگئی تھی، دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وینس کو ان مذہبی لڑائیوں سے زیادہ نفع حاصل ہوا، (ص ۷۱ - ۳۰۷) وینس کے تاجروں نے تو اسکندریہ

کے مسلمانوں سے اپنی تجارت کی خاطر دوستانہ تعلقات بھی پیدا کر لئے تھے، اور جب یہ لڑائیاں ختم بھی ہوگئیں تو ان کی تجارت بدستور جاری رہی، جب ان کی تجارت خطرے میں پڑ جاتی تو اطالوی تجار صلیبی جنگ سے آزردہ اور بددل رہتے، (کریڈ از آر جے اینڈ کنگسفورڈ ص ۳۴۴ - ۴۳۶) پہلے ذکر آیا ہے کہ اطالوی تاجروں نے اپنے تجارتی مفاد کی خاطر صلیبیوں کا رخ زارا اور قسطنطنیہ کی طرف بھی موڑ دیا تھا، زارا ان کا تجارتی حریف ہوگیا تھا، اس کی تباہی کے بعد تجارت پر وینس کا پورا قبضہ ہوگیا، اس کی تفصیل لکھتے ہوئے "دی بازنطینی امپائر" کے مصنف سی ڈبلیو، سی اومان رقمطراز ہے، کہ چوتھی صلیبی جنگ میں صلیبی وینس میں مقیم تھے، وہ اس مہم پر روانہ ہوئے تھے کہ مصر کے سلطان العادل پر وہاں پہونچ کر ایک کاری ضرب لگائیں، وینس کے تاجروں نے ان کو بحری بیڑے دینے کا وعدہ کیا تھا، مگر اس شرط پر کہ وہ مصر کے ساحل پر حملہ آور نہ ہوں، کیونکہ ان تاجروں کے تعلقات مصر کے سلطان سے بہت اچھے تھے، جس نے اسکندریہ میں ان کو اتنی تجارتی رعایتیں دی تھیں کہ ہندوستان تک کی تجارت ان کے ہاتھوں میں آگئی تھی، اس لئے ان تاجروں نے ان صلیبیوں کا رخ موڑ دیا، صلیبیوں نے وینس کے تاجروں سے جہاز ونکا جو کرایہ دینے کا معاہدہ کیا تھا وہ نہ دے سکے تو تاجروں کو ایک بہانہ مل گیا، زارا کے شہری ان دنوں وینس سے بغاوت کر کے ہنگری کے بادشاہ سے مل گئے تھے، وینس کے تاجروں نے صلیبیوں سے کہا کہ اگر وہ زارا پر حملہ کر کے وینس کے ماتحت کر دیں تو وہ ان کے سارے قرض معاف کر کے ان کو وہاں پہونچا دیں گے، جہاں جانا چاہتے ہیں، صلیبی مسلمانوں کے خلاف ایک مقدس جنگ کرنے چلے تھے، لیکن وہ اب عیسائیوں کے ایک قصبہ کی طرف بڑھے، ضمیر رکھنے والے اس کے لئے آمادہ نہ ہوتے، وہ تو مصر کی مہم کے لئے اصرار کرتے، لیکن صلیبیوں کے یہاں گذشتہ ایک سو سال سے ضمیر کمیاب ہوتا جا رہا تھا، ان میں حریص مہم باز فوجی سردار تھے، جو زارا پر

حملہ کرنے کے لئے راضی ہو گئے، .

زارا کی تسخیر ہو گئی، تو وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے ...... جہاں کے حکمراں کے بھتیجے الیکزیس نے ان کو قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کی دعوت بھی وعدہ کر کے دی کہ وہ ان کو روپیہ، رسد، جنگی بیڑے اور فوج بھی دے گا، پوپ زارا جیسے عیسائی شہر پر ان صلیبیوں کے حملہ سے آزردہ تھا، مگر وینس کے تاجر صلیبیوں کو مصر پر حملہ کرنے سے باز رکھنا چاہتے تھے، اس لئے وہ بھی ان کا رخ قسطنطنیہ کی طرف موڑ دینا چاہتے تھے .... یہ صلیبی قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے .... اور جب اس کو فتح کیا تو تین دن زنا اور غارت گری کا جشن مناتے رہے، نائٹ اور سپاہی اپنی پسند کے گھر میں گھس جاتے، اور اندر جا کر ان کا جو جی چاہتا کرتے، گرجاؤں اور ننوں کی رہائش گاہوں کو بھی نہ چھوڑا، پوپ بھی چیخ اٹھا کہ اس قسم کی فتح سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، شراب پی کر بدمست سپاہیوں نے ایک طوائف کو سینٹ صوفیہ کے منبر پر بٹھا کر اس کی تاج پوشی کی، اور اس سے ناشائستہ گانے گوائے اور ناروا رقص کرائے، صلیبیوں کے ساتھ بہت سے پادری بھی تھے، وہ اپنے ہموطنوں کو ان ناروا حرکتوں سے روکنے گئے، مگر وہ خود لوٹ میں مشغول ہو گئے، گرجاؤں میں جتنی مقدس چیزیں تھیں، اُن سب کو انھوں نے لوٹا، ایک یونانی مصنف نے اس غارت گری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس نے لکھا کہ کافر مسلمانوں نے ایسی ناروا حرکتیں نہیں کیں، جو ان صلیبیوں کے ذریعہ سے عمل میں آئیں، مسلمانوں نے جب کوئی شہر فتح کیا تو انھوں نے گرجاؤں اور عورتوں کا احترام کیا، (باب ۲۲ ص ۲۹۰-۲۷۹)

وینس کے تاجروں کے ساتھ مارسیلز کے تاجروں نے بھی فلسطین میں اپنی تجارت کی منڈی قائم کر دی تھی، اس طرح انگلستان، جرمنی، ڈنمارک اور ناروے کے تجارتی بیڑے بھی

بحر قلزم میں پہنچنے لگے، جس سے ان ملکوں کی دولت میں اضافہ ہونے لگا، پروشیا کے تاجروں نے بھی اس سے فوائد اٹھائے، تجارت بڑھی تو بینک بھی قائم ہونے لگے، زرمبادلہ کی سرگرمیاں بھی بڑھیں، بحری قوانین کا نفاذ بھی صلیبی جنگ کے ہی زمانہ سے شروع ہوا، اس تجارت سے مرچوں، مسالہ، خوشبوئیات کا رواج یورپ میں ہونے لگا، صقلیہ میں ریشم کے کارخانے قائم ہوئے گنّے کی پیداوار بھی وہاں ہونے لگی، روئی اور ریشم کی صنعتیں شام سے یورپ میں آنے لگیں، ایران سے خوشبوئیات، ہندوستان سے مسالہ اور جواہرات، اور چین سے چینی برتن آنے لگے (آرچر اینڈ کنگسفورڈ ص ۴۴۰، ۴۴۳) موسیو لیبان لکھتا ہے کہ وہ تجارتی ترقی جو صلیبی جنگوں کی وجہ سے پیدا ہوئی صلیبیوں کے ایشیا سے نکالے جانے پر بھی ختم نہیں ہوئی، کیونکہ اطالیہ کے اکثر خود مختار تجارتی بندروں نے سلاطینِ اسلام کے ساتھ معاہدے کر لئے تھے، اور یہی مشرقی تجارت وینس کی سرسبزی اور قوت کا باعث ہوئی اور اس وقت تک عروج پر رہی، جب کہ نئے بحری راستوں کے قائم ہونے سے یہ تجارت دوسری قوموں کے ہاتھوں میں چلی گئی، (تمدن عرب ص ۳۱۰) یہی مورخ لکھتا ہے، صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے لکڑی اور فلزات کی دستکاریاں، چینی اور شیشے کے عمدہ کام کی واقفیت ایشیا سے یورپ کو ہوئی، صور کے شیشہ کے آلات وینس کے لئے نمونے بن گئے، ریشمی کپڑوں کا بننا اور ان کا عمدگی کے ساتھ رنگنا، جو مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ پر تھا، یورپ میں پھیل گیا، پھر صلیبی فوج کے ساتھ جو تجار اور صیقل گر شام سے گئے، انھوں نے اپنے پیشوں سے متعلق وہاں سے بہت کچھ سیکھا، (ایضاً ص ۳۱۰-۳۱۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں کروسیڈ کے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ بہت سے نئے پودے نئے پھل، نئے رنگ، پوشاک میں نئے فیشن، شکر، باجرہ، لیمو، خوبانی، تربوزے، روئی، ململ، لبوٹے دار ریشمی کپڑے، بنفشئی ارغوانی اور آسمانی رنگ، پوڈر، آئینے اور تسبیح کے دانے وغیرہ

یورپ میں صلیبی لڑائیوں کے بعد ہی یورپ میں مشرق سے آنے لگے (مضمون کروسیڈ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ج ۷، ص ۵۵۰-۵۴۹، گیارہواں ایڈیشن)

معاشرتی اثرات لیبان لکھتا ہے کہ فنون اور صنعت میں مشرق کا اثر یورپ پر بہت کچھ ہوا، ان پرتکلف اور خوبصورت اشیا کو دیکھ کر جو مشرق میں قسطنطنیہ سے لے کر مصر تک موجود تھیں صلیبیوں کا مذاق درست ہوگیا، یورپ کا طرز عمارت بھی بالکل بدلنے لگا، ان کی عمارتوں میں عرب کے تمدن کے اثرات پائے جانے لگے، (تمدن عرب ص ۳۱۱) آرچر اور کنگسفورڈ نے لکھا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کے بعد یورپ میں تاجروں کے ذریعہ سے تعیشات کے سامان آنے لگے، تو ان کے باشندوں کا معیار زندگی عیش پسندی کی حد تک بڑھ گیا (ص ۴۳۶) فلپ ہٹی لکھتا ہے کہ عیسائی جب بیت المقدس پہونچے تو ان کا خیال تھا کہ وہ مسلمانوں سے اپنے تمدن میں برتر ہیں، وہ مسلمانوں کو بت پرست سمجھتے، ان کا عام خیال تھا کہ وہ محمدؐ کو خدا کی حیثیت سے پرستش کرتے ہیں، لیکن ان کا میل ملاپ مسلمانوں سے بڑھا تو ان کی یہ غلط فہمی جاتی رہی، اور جب ان کا باہمی ملنا جلنا بڑھا تو دونوں کے خیالات میں نمایاں فرق ہونے لگا، دونوں میں ہمسایہ کے دوستانہ تعلقات پیدا ہونے لگے، عیسائی اپنے یہاں مقامی کاریگروں اور کاشتکاروں کو رکھنے لگے،

انھوں نے اپنی جاگیر میں فیوڈل نظام قائم کیا تھا، مگر مقامی نظام ہی کو اختیار کرلیا، وہ اپنے ساتھ گھوڑے، باز اور کتے بھی لے گئے تھے، انھوں نے یہ معاہدہ کرلیا کہ ان کے شکار کی مہم میں ان پر کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا، دونوں طرف سے مسافر اور تاجر بحفاظت تمام آنے جانے لگے، عیسائیوں نے اپنا یوروپی لباس پہننا چھوڑ دیا، اور عربوں کا مناسب اور آرام دہ لباس پہننے لگے، وہ ایسی غذائیں بھی کھانے لگے، جن میں مسالہ اور شکر زیادہ

ہوتی، وہ ایسے مشرقی طرز کے مکانات بھی پسند کرنے لگے، جن میں وسیع صحن اور فوارے ہوتے، انھوں نے مقامی باشندوں سے شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرنا شروع کیا، اور وہ مسلمانوں حتی کہ یہودیوں کے متبرک مقامات کا احترام بھی کرنے لگے، اور جب وہ آپس ہی میں لڑ جاتے تو ان کفار (یعنی مسلمانوں) سے مدد کے خواستگار بھی ہوتے، مسلمان بھی مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں سے مدد لیتے (ہسٹری آف دی عربس ص ۶۴۳-۶۴۴) انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ اول نے تو یہ تجویز پیش کی تھی کہ یورپ کی شہزادیاں مسلمانوں کے حرم میں بلا تکلف داخل کردی جائیں، تاکہ وہ اپنے حسن سے اپنے مسلمان شوہروں کو اپنا مذہب بدلنے پر آمادہ کریں (کروسیڈ ص ۴۲۹) یورپ کے مدبرین کی یہ پرانی چال رہی ہے کہ تیغ وسنان سے کام لینے کے ساتھ حسین عورتوں کے مژگان سے بھی کام لیتے رہے ہیں، سلجوقی خاندان اور دولت عثمانیہ کے فرمانرواؤں کے حرم میں یورپ کی بہت سی شہزادیاں داخل ہوئیں،

علمی اثرات صلیبی لڑائیوں کے بعد یورپ کے جغرافیہ دانوں کو ایشیا کے جغرافیہ سے واقف ہونے کی کوشش کی تو جغرافیہ پر اچھا لٹریچر فراہم ہوگیا، پھر مورخوں نے ان لڑائیوں کی تاریخیں لکھیں، تو تاریخی لٹریچر میں مفید اضافہ ہوا، ان پر اچھی اچھی نظمیں بھی لکھی گئیں، فرانسیسی شاعری پر تو صلیبی لڑائیوں کا اچھا خاصا اثر پڑا، اسی کے بعد یورپ والوں کو مشرق کی زبانوں کے سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، ۱۳۱۱ء تک آتے آتے یورپ میں مشرقی زبانوں کے چھ اسکول کھل گئے، اور مشرق کے بہت سے قصے یورپ میں لکھے جانے لگے، مغربی یورپ کے ملکوں کی زبانوں میں عربی کے کچھ الفاظ بدلی ہوئی شکلوں میں استعمال ہونے لگے، تجارت، جہازرانی اور موسیقی کی بھی اصطلاحات عربی زبان سے لئے گئے (انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، ج ۷، ص ۵۵۰-۵۴۹، گیارہواں ایڈیشن)

مسلمان سلاطین کے کردار اور شجاعت کا اثر

صلیبی بلکہ خود یورپ کے فرمانروا عماد الدین زنگی، نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے کردار اور شجاعت سے مرعوب اور متاثر رہے، جیسا کہ یورپ کے حسب ذیل مورخین کے بیانات سے ظاہر ہوگا۔

گبن لکھتا ہے کہ عماد الدین زنگی نے افرنجیوں سے انطاکیہ میں لڑکر اپنی سپہگری کی شہرت قائم کی، اس نے تیس معرکے اور سر کئے جس کے بعد اس کو موصل کا علاقہ دیا گیا تاکہ وہ اپنے پیغمبر کے مشن کا حق ادا کر سکے، اور اس نے اپنے عوام کی امیدوں کو پورا کیا، اس نے پچیس[25] دن کے محاصرہ کے بعد الرہا (اڈیسا) کی تسخیر کی، اور افرنجیوں نے فرات تک کے جو علاقے فتح کر لئے تھے، ان کو پھر سے حاصل کیا، اس نے کردستان کے جنگجو قبیلوں کو بھی سر کیا، اس کے سپاہی اپنے فوجی کیمپ ہی کو اپنا ملک سمجھتے، ان کو اپنے اس آقا کے فیاضانہ انعامات کے عطا کرنے پر پورا بھروسہ رہتا، اور وہ بھی ان کی عدم موجودگی میں ان کے خاندانوں کی پوری نگہبانی کرتا،

اس کے لڑکے نورالدین نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی قوت کو متحد کیا، حلب کی حکومت میں دمشق کا اضافہ کیا، شام کے عیسائیوں کے خلاف بڑی طویل لڑائی لڑتا رہا، اس نے اپنی سلطنت کی سرحد دجلہ سے نیل کے ساحل تک بڑھا دی، عباسیوں نے اس کو وہ سارے خطابات اور مراعات دیئے جو بادشاہت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، عیسائی خود اس کی ہوشمندی، شجاعت، انصاف پسندی اور سیرت کی طہارت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے، اپنی حکومت کے زمانہ میں اس مقدس سپاہی نے اسلام کے پہلے چار خلفا کے جوش و خروش اور سادگی کا اعادہ کیا تھا۔ اس کے محل میں سونا اور ریشمی کپڑے نہیں دکھائی دیتے، اس کی مملکت میں شراب کا استعمال ممنوع تھا، بیت المال کی آمدنی عوام کی خدمت میں بھی صرف ہوتی، اس کی خانگی زندگی بہت ہی سادہ تھی، جس کے مصارف اس مال غنیمت سے پورے کیے جاتے جو اسکو جائز طریقہ سے ملتا اسکی ملکہ اپنی ضروریات کے لئے کچھ رقمیں مانگتی

تو وہ کہتا کہ "مجھ پر خوفِ الٰہی طاری رہتا ہے، میں مسلمانوں کا صرف خزانچی ہوں، میں ان کے مال کا ناجائز مصرف نہیں لے سکتا، حمص میں میری ملکیت میں تین دکانیں ہیں، یہی تم لے سکتی ہو"، اس کی عدالت میں بڑے سے بڑے لوگوں پر دہشت طاری ہو جاتی، اور یہ غربا کی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی، اس کی وفات کے چند سال کے بعد ایک مظلوم دمشق کی سڑکوں پر چلا کر کہتا تھا، نورالدین! نورالدین! اب تم کہاں گئے، اٹھو آؤ، اور ہم لوگوں پر رحم کھاؤ، اور ہم کو بچاؤ، اور جب کوئی انتشار پھیلتا، تو ایک ظالم کی گردن نورالدین کے نام سے جھک جاتی (فال اینڈ ڈکلائن آف دی رومن امپائر، ج ۷، ص ۸۸ - ۴۸۷)

گبن صلاح الدین ایوبی کے بارہ میں لکھتا ہے کہ وہ کھردرے قسم کا اونی لباس پہنتا، صرف پانی ہی اس کے مشروبات میں تھا، اپنی سیرت کی پاکیزگی میں اپنے رسول سے بھی آگے چلا گیا تھا، (۱) وہ اپنی زندگی اور عمل میں کٹر قسم کا مسلمان تھا، وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ اپنے مذہب کی مدافعانہ لڑائیوں کی خاطر حج کرنے کو نہیں جا سکتا ہے، وہ حج کے لئے جاتا رہا، پانچوں وقت کی نماز با جماعت ادا کرتا، وہ روزے بھی برابر رکھتا رہا، اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر بھی کلام پاک کی تلاوت کر لیا کرتا تھا، اور جب غنیم کی یورش ہوتی تو بھی اس کی تلاوت میں مشغول رہتا، یہ بظاہر نمائشی چیز معلوم ہوتی ہے، مگر اس سے اس کی پرہیزگاری اور ہمت دونوں ظاہر ہوتی ہے، وہ شافعی مسلک کا تھا، اس لئے اسی مسلک کے عقائد کا مطالعہ کرنے کی ترغیب کر دیتا، شعراء اس کی مذمت سے محفوظ رہے، لیکن اس کو غیر مذہبی علوم سے نفرت تھی، ایک فلسفی نے بہت سی نئی باتیں کہیں تو وہ اس کی سزا کا مستحق ہو گیا، اس کی عدالت کا دروازہ ادنی آدمیوں کے لئے کھلا رہتا اور وہ اس کے اور اس کے وزراء کے خلاف مقدمے دائر کر سکتے تھے، سلطان صرف اپنی سلطنت کے مفاد میں ہی کبھی انصاف سے تجاوز کر جاتا، سلجوقیوں اور زنگیوں کے

(۱) نعوذ باللہ ع

جانشین اس کے رکاب میں ضرور رہتے، اس کی پوشاک کو جھاڑا کرتے، مگر وہ اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ ملازموں کے لئے نرم اور رحمدل رہا، اس کی فیاضی کی کوئی انتہا نہ تھی، عکہ کی تسخیر کے وقت اس نے بارہ ہزار گھوڑے تقسیم کئے، جب اس کی وفات ہوئی تو اس کے خزانے میں صرف ۴۷ نقرئی درہم اور ایک اشرفی تھی، لیکن اس کی فوجی حکومت میں متمول شہری کسی خوف اور خطرہ کے بغیر اپنی محنت کا صلہ پاتے رہتے، اس زمانہ میں مصر، شام اور عرب کو اسپتالوں، مدرسوں اور مسجدوں سے آراستہ کیا گیا، قاہرہ کو حصار سے محفوظ کیا گیا، سلطان اپنے کو کسی نہ کسی مفید کام میں مشغول رکھتا، وہ کسی باغ میں تفریح کے لئے نہیں جاتا اور نہ اپنے محل کے اندر کوئی تعیش کا سامان کرتا، یہ مذہبی جنون کا زمانہ تھا، لیکن صلاح الدین کی خوبیوں سے خود عیسائی متاثر ہو کر خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے، جرمنی کے شہنشاہ کو اس کی دوستی پر فخر رہا، یونانی شہنشاہ اس سے اتحاد اور تعاون کا خواستگار ہوا، اور جب سلطان نے یروشلم کو فتح کیا تو اس کی شہرت کو چار چاند مشرق اور مغرب دونوں جگہوں میں لگے (ایضاً ص ۴۰۶-۴۰۷)

آرچر اور کنگسفورڈ عماد الدین زنگی کے بارہ میں رقمطراز ہیں کہ زنگی کی سیرت میں بہت سے شریفانہ اوصاف تھے، وہ ایک بہادر سپاہی، ایک لائق جنرل اور ایک ہوشمند مدبر تھا، اس کی سب سے بڑی کمزوری صرف یہ تھی کہ وہ فریب اور جھوٹ سے بھی کام لیا کرتا تھا، لیکن ایک حکمراں کی حیثیت سے وہ حکومت کے ہر چھوٹے بڑے کام پر نظر رکھتا تھا، اور اپنی انتھک سرگرمیوں کی بدولت وہ مستقبل کے واقعات سے بھی باخبر ہو جاتا، وہ اپنے ماتحتوں کے لئے ضابطہ کی پابندی میں بہت سخت تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ ایک ملک میں ایک ہی ظالم کو ہونا چاہئے، اس کے خوف سے ہر شخص لرزہ براندام رہتا، ایک بار اس نے ایک ملاح کو اپنی ڈیوٹی کے وقت سوتا پایا جب اس نے اس کو جگایا تو اس پر اتنا خوف طاری ہوا کہ اسی وقت گر کر مر گیا (کریڈ ص ۲۰۴)

یہی مصنفین نور الدین کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ بہت ہی ہوشیار قسم کا سپاہی تھا، اپنے باپ ہی کی طرح اپنے ماتحت سپاہیوں کا بڑا خیال رکھتا، مگر ان کو لوٹ کی اجازت نہیں دیتا، پھر بھی اس کے سپاہی اس سے محبت کرتے اور لڑائی میں بڑی پامردی سے اس کا ساتھ دیتے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ لڑائی میں مارے بھی گئے تو سلطان ان کے اہل وعیال کی پوری خبر گیری کرتا رہے گا، ایک بار اس نے درویشوں کے ساتھ بڑی فیاضی کی جس سے اس کے سپاہیوں کو کچھ ناگواری ہوئی، لیکن اس نے ان کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ ان لوگوں کو حق ہے کہ ہماری فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، میں تو ان کا ممنون ہوں کہ وہ اسی پر قناعت کر لیتے ہیں جو اپنے حق کی بنا پر طلب کرتے ہیں، ایک بار ایک امیر نے خراسان کے ایک عالم کی تضحیک کی تو نور الدین نے اس سے کہا کہ اگر تم ان کی برائی بیان کرو گے تو میں تم کو سخت سزا دوں گا، گو تم حق بات ہی کیوں نہ کہو، اس عالم میں ایسی خوبیاں ہیں کہ اس کی برائیاں دب کر رہ جاتی ہیں، مگر تم اور تمہارے جیسے لوگوں میں تمہاری برائیاں تمہاری خوبیوں سے بہت زیادہ ہیں،

نور الدین کو تعمیرات سے بھی بڑا شوق تھا، شام میں زلزلہ آیا، تو اس کے بڑے شہروں کی از سر نو حصار بندی کرائی، اس نے ہر جگہ مسجدیں بنوائیں، بہت سے شہروں میں اسپتال قائم کئے، ابن اثیر اپنے تنخواہ دار طبیب سے آزردہ ہو کر دمشق پہونچا، وہاں کے اسپتال والوں نے اس کی خدمت کی اور اس نے ان کو کچھ انعام دینا چاہا تو انھوں نے کہا کہ ہم تو نور الدین سے بھی انعام لینا پسند نہیں کرتے۔

اسلامی فقہ کے مطابق جن کھانوں، مشروبات اور پوشاکوں کی اجازت تھی، وہی نور الدین استعمال کرتا، اور اپنی رعایا سے بھی استعمال کراتا، اس کے دربار میں بڑے آداب برتے جاتے، کوئی اس کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا تھا، صرف صلاح الدین کے باپ ایوب کو بیٹھنے

کی اجازت ہوتی۔...... وہ چوگان کھیلا کرتا، یہی اس کی تفریح تھی، مگر وہ کہتا کہ وہ اس تفریح میں اس لئے مشغول رہتا ہے کہ اس سے اس کی سپہگری بیدار رہتی ہے، اور گھوڑوں کی بھی تربیت ہو جاتی ہے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی تفریح میں بھی ریاضت پیدا کر لی تھی۔

نور الدین کی سیرت میں اس کے مذہبی جذبات کو بڑا اثر تھا، ان ہی جذبات کی بنیاد پر وہ عیسائیوں سے برابر جنگ کرتا رہا، ایک بار اس سے کہا گیا کہ اس کے بھائی کی ایک آنکھ اس مقدس جنگ میں جاتی رہی تو اس نے نہ افسوس کیا اور نہ اپنے بھائی سے ہمدردی کا اظہار کیا، بلکہ یہ کہا کہ اگر میرا بھائی دیکھ سکتا کہ اس کے صلہ میں اس کو بہشت میں کیا ملے گا تو وہ اپنی دوسری آنکھ کو بھی قربان کرنے کو تیار ہو جاتا، وہ اپنی لڑائی میں اپنے تحفظ کی بھی فکر نہ کرتا، ایک بار اس کے ایک رفیق نے کہا کہ وہ اپنی جان کی فکر نہیں رکھتے، اگر ان کی جان جاتی رہی تو پھر اسلام کا کیا حشر ہوگا، نور الدین نے جواب دیا، نور الدین کون ہے، وہ کیا ہے، ہمارے ملک اور ہمارے مذہب کا محافظ مجھ سے بہتر موجود ہے اور وہ خدا ہے (ص ۱۴۱ - ۲۴۰)

یہی مصنفین صلاح الدین کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ صلاح الدین کو خراجِ عقیدت عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں نے پیش کیا ہے، تاریخوں اور افسانوں میں اس کا نام اس کے حریف رچرڈ شیر دل کے ساتھ لیا جاتا ہے، ہربرٹ والٹیر کا بیان ہے کہ اگر دونوں کی خوبیاں ایک دوسرے میں جمع ہو جاتیں تو دنیا میں پھر ایسے دو شہزادے کبھی نہیں پیدا ہوتے، جب صلاح الدین مرنے لگا تو اس نے اپنے علم بردار کو بلا کر کہا کہ تم نے لڑائی میں میرے علم کو برابر ہاتھ میں رکھا، میری وفات کے بعد بھی میرے جنازہ کے علم کو اپنے ہاتھ میں رکھنا، ایک معمولی چیتھڑے کو ایک نیزہ پر رکھنا اور چلاتے رہنا، دیکھو مشرق کا شہنشاہ اپنے ساتھ دنیا سے صرف کپڑے کا یہ ٹکڑا لے جا سکا،

اسٹینلی لین پول عماد الدین زنگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے، اتابک زنگی بڑا مردم شناس تھا، اگر کوئی لائق ملازم یا امیر اس کے ہاں ہوتا تو اسے یقین رہتا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس کا معتمد ہو جائے گا..... وہ اپنے لشکر میں کسی قسم کے جبر و ظلم کو گوارا نہ کرتا تھا، عورتوں کی آبرو ریزی پر جیسی سخت سزا وہ دیتا تھا اس زمانہ میں کہیں نہ دی جاتی.... جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا ، دو رسیاں تان دی گئی ہیں، اور سپاہ ان کے درمیان سے گذر رہی ہے، کسی کو حکم نہ تھا کہ کسی کاشتکار سے وہ ایک تنکہ بغیر قیمت دیئے لے سکے..... تنگ دستوں کی شرح مقرر کرنے میں نرمی کرتا، مگر دولت مند شہروں سے مصارف جنگ کے لئے کثیر رقمیں وصول کرتا تھا، مگر جس قدر روپیے وصول کرتا، اس سے زیادہ کام کر دیتا، اس کی سختی و سیاست کا نتیجہ تھا کہ تمام عمل داری میں امن و خوشحالی کو ترقی رہی، (صلاح، ص ۳۹ - ۳۸)

نور الدین کے متعلق رقمطراز ہے کہ وہ ایک عادل بادشاہ تھا، دانشمند اور یکا دیندار تھا، گو عیسائیوں پر وہ بہت سخت تھا، مگر عدل وہ صفت تھی جس کی قدر و قیمت اس کے دل میں خدا کے بعد تھی، اس کی رعایا میں اسے اگر کوئی شخص قاضی کی عدالت میں طلب کرتا تو ضرور حاضر ہوتا،...... بیت المال کے روپئے کو ہاتھ نہ لگاتا،..... اس کی سنجیدہ اور متین آنکھوں کا پُر سکوت عالم، بارعب پیشانی اور گندم رنگ میں ایک گھلاوٹ پیدا کرتا، چہرہ تقریبًا بے ریش تھا، اس میں ایک شریف انسان کا انداز خودداری اور صدق و صفا پایا جاتا تھا، جہاں کہیں وہ ہوتا خاموشی اور سکوت طاری ہوتا رہتا۔ (ص ۱۱۶ - ۱۱۵)

لین پول نے تو صلاح الدین پر پوری ایک کتاب ہی لکھ دی، وہ اس کے ہر وصف کو جھوم جھوم کر لکھتا ہے اور بڑی بلند آہنگی سے ایک جگہ تحریر کرتا ہے کہ وہ نہ

صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شہامت میں یکتا اور بے مثل تھا (صلاح الدین ص ۲۰۵)

فلپ ہٹی لکھتا ہے کہ عماد الدین زنگی کی وجہ سے صلیبی جنگ کا رخ اسلام کی حمایت میں بدل گیا، وہ ان ہیروؤں کا ہیرو تھا، جن کی انتہا صلاح الدین کی ذات میں ہوئی، وہ اسلام کے کاز کا پہلا چمپین تھا، مگر اس کا بیٹا نور الدین اس سے زیادہ لایق ثابت ہوا (ص ۶۴۴-۶۴۵) صلاح الدین کا نام تو مسلمانوں کے محبوب حکمرانوں کی فہرست میں ہارون رشید اور بیبرس کے ساتھ ابتک سرفہرست ہے، یورپ میں تو گانے والوں اور ناول نگاروں کے لئے ایک موضوع بنا ہوا ہے، اور اب تک بہادری کا پیکر سمجھا جاتا ہے، (ص ۶۵۲)

صلیبی جنگ کا تجزیہ

اب تک گذشتہ اوراق میں صلیبی لڑائیوں اور ان سے متعلق اور تمام باتوں کا ذکر یورپ کے مصنفوں ہی کی روشنی میں کیا گیا ہے، ان کا تجزیہ ان سے الگ ہو کر بھی کرنے کی ضرورت ہے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں میں ان لڑائیوں میں بڑا مذہبی جوش پیدا ہوا، مگر سوال یہ ہے کہ کس کی مذہبیت میں ایمان کی طہارت اور کردار کی پاکیزگی زیادہ تھی، طرفین اور فریقین اپنے دعاوی میں پیش قدمی کر سکتے ہیں مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسائی بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننا چاہتے تھے، مگر وہ چھین نہ سکے، مسلمانوں کا قبضہ اس پر بدستور سابق رہا، اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی سپہگری اور ایمان کی ولولہ انگیزی میں عیسائیوں سے برتر رہے، مسلمانوں کی تاریخ میں صلیبی جنگ کا عہد بہت ہی نازک ترین دور تھا، پوری عیسائی دنیا ان کی اور ان کے مذہب کی بیخ کنی کے لئے امنڈ پڑی تھی، مگر انھوں نے جس پامردی اور نبرد آزمائی سے ان کا مقابلہ کر کے

ان کے ارادوں کو ملیامیٹ کیا، وہ ان کی تاریخ کا بہت ہی زریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے،

عیسائی ان لڑائیوں کو صلیبی کہہ کر مذہبی قرار دیتے رہے، مگر یہ مذہبی اس لئے نہیں کہی جا سکتی ہیں کہ، حضرت عیسیٰؑ کی تو یہ تعلیم بتائی جاتی ہے کہ تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے داہنے گال پر تھپیڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگار لیجائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے تو اس کو اپنا کرتا بھی دیدے، کیا عیسائیوں نے اس تعلیم پر عمل کیا اور اگر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا تو کیا ان کے راہبوں اور قسیسوں نے ان کو حضرت عیسیٰؑ کی یہ تعلیم بتائی تھی کہ مقدس جہاد کرو تو اپنا خون بہاؤ اور اتنا قتل عام کرو کہ فوجیوں کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں خون میں ڈوبے ہوئے ہوں، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیواروں سے ٹکرا دو اور ان کو حکم دے کر فصیل سے پھینک دو، لوگوں کو زندہ جلا دو، عورتوں کے جسم کو ریزہ ریزہ کر دو، ان کی لاشوں اور کٹے ہوئے اعضاء کے ڈھیر لگا دو، (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۶ مضمون کروسیڈ گیارہواں اڈیشن)

یورپ کے مستشرقین جب مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ لکھتے ہیں تو اس کو تعصب کی دوکان بنا دیتے ہیں، مگر کبھی جادو سر پر چڑھ کر بھی بولتا ہے، خود یورپی مصنفوں نے اس جنگ میں عیسائیوں کے جو غیر روادارانہ مظالم بیان کئے ہیں، ان کی تفصیل گذشتہ اوراق میں آ چکی ہے، اس سے انسانیت کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے، لین پول کو لکھنا پڑا کہ صلیبیوں نے بیت المقدس میں داخل ہو کر جو قتل عام کیا اس سے مسیحی دنیا کی عزت میں بٹہ لگا ہے، (صلاح الدین ص ۳۴۰) اور آج بھی ان کی لڑائیوں سے مسیحی دنیا کی عزت میں بٹہ لگ رہا ہے، پہلی اور دوسری جنگ عظیم ہیروشیما اور ویٹ نام میں انھوں نے جو ہولناکیاں کیں، ان سے چنگیز خاں اور ہلاکو کی سفاکیاں بھی ماند پڑ گئیں، انھوں نے

ان لڑائیوں میں جو کچھ کیا، کیا وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے عین مطابق تھا،

اور اگر صلیبیوں نے یہ مقدس لڑائیاں اس لئے لڑیں کہ بیت المقدس ان ہی کی اصل عبادت گاہ ہے، وہ اس سے کسی حال میں دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، تو پھر اسی سرزمین میں ان کی لڑائیاں محدود ہوتیں، مگر ریجی نالڈ نے تو جزیرۃ العرب کی طرف بھی فوج کشی کی کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو منہدم کر دیا جائے۔ صرف اس واقعہ سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ صلیبی جنگ بیت المقدس کے لئے نہ تھی بلکہ اسلام کو اس روئے زمین سے مٹا دینے کی کوشش تھی، اس مذہبی جنون میں پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف دو سو سال تک مبتلا رہا، اس سے بڑھ کر غیر رواداری، عداوت اور تعصب کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اور اگر یہ واقعی مقدس جہاد اس لئے تھا کہ حضرت عیسیٰؑ جہاں پیدا ہوئے اور جہاں سولی پر چڑھائے گئے، اس لئے اس پر قبضہ عیسائیوں ہی کا ہونا چاہئے تھا، تو آج بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا تسلط ہے، یورپ میں پوپ، قسیس اور راہب کیوں نہیں اس کا اعلان کرتے کہ یورپ کے تمام عیسائی سرخ کپڑے کی صلیب اپنے سینوں پر لگا کر اور اپنی ساری چیزیں لٹا کر بیت المقدس کی طرف کوچ کریں اور اس کو اسرائیلیوں کے ناپاک وجود سے آزاد کر کے پاک کریں، اربن، پیٹر دی ہرمٹ، ریجی نالڈ، فلپ، آگسٹس، فریڈرک، باربروسا، رچرڈ شیر دل اور سینٹ لوئی، جیسے فدائیانِ عیسائیت پیدا ہو کر کیوں نہیں آگے بڑھتے، آہن پوش جوان اور جنگی بیڑے اس کی ناپاکی کو دور کرنے کے لئے کیوں نہیں بھیجے جاتے، اور موجودہ پوپ کی طرف سے یہ اعلان کیوں نہیں ہوتا کہ جو شخص بیت المقدس کی طرف کوچ کرنے میں صلیب نہیں اٹھائے گا، وہ میرا پیرو نہیں ہے، مگر اسرائیلیوں سے یہ مذہبی لڑائی لڑنے کے بجائے ان کی اسلام دشمنی یہ کام کر رہی ہے کہ تمام اسلامی ممالک

کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں ایسی پیچیدگی اور زبوں حالی پیدا کر دی جائے کہ وہ کسی طرح پنپنے نہ پائیں، جیسا کہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں ان کی کوشش رہی۔

اب ذرا اس جنگ میں بعض مسلمانوں کی عملی سرگرمیوں پر بھی تبصرہ کرنے کی ضرورت ہے، اسلام مسلمانوں میں وصل نہ کہ فصل کی تعلیم دیتا ہے، قرآن مجید کی تعلیم ہے کہ مسلمان باہمی عصبیت کا شکار نہ ہوں (مائدہ ۲۰۔ نساء ۱۴۱) وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، (حجرات ۱)

مگر کیا ان صلیبی لڑائیوں میں تمام مسلمانوں نے یہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا، یورپ کی سامراجیت کی جارحیت ان پر اس لئے ہوئی کہ وہ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ کر مجموعی حیثیت سے کمزور تھے، ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر صلیبی ان پر ٹوٹ پڑے، اس نازک موقع پر تمام مسلمانوں کو متحد ہونا چاہئے تھا، مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ جب متحدہ یورپ کا زبردست حملہ اسلام کی بیخ کنی کے لئے ہو رہا تھا، تو شام اور اس کے آس پاس، ربیعہ، موصل حلب، بوزنیج، نصیبین، بخارا، حالبور، دمشق، حماۃ، حمص اور حران وغیرہ جیسی چھوٹی حکومتیں علٰحدہ رہ کر مسلمانوں کی قوت کو کمزور کر رہی تھیں، عماد الدین، نورالدین اور صلاح الدین نے ان کو ملا کر متحد کرنے کی کوشش کی، مگر اسلامی حمیت اور دینی غیرت کو بالائے طاق رکھ کر ان میں سے بعض حکومتیں اپنی خود غرضی اور مفاد پرستی کی بنیاد پر صلیبیوں سے مل جاتیں، معین الدین آنر، سیف الدین، اس کے جانشین عزالدین اس کے چچازاد بھائی عماد الدین اور دمشق کے امراء نے ان سرفروش اور جانباز سلاطین کے خلاف صلیبیوں سے مل کر اپنی خیر تو کچھ دن منالی، مگر اس طرح اسلام سے غداری کی۔

عماد الدین، نورالدین اور صلاح الدین کے کارناموں سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ اگر مسلمان متحد ہوں، ان میں ایمان پروری، دینی حمیت اور ملی غیرت ہو، اور پھر ان کے

قائدین میں سیرت کی طہارت ہو، کردار کی بلندی ہو، سیاسی بصیرت ہو، جنگی قیادت کی ہوشمندی ہو، تو وہ دنیا کی بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا کر فاتح، کامراں اور سرخرو ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کے یہی اثرات اس وقت کے یورپ کے فرمانرواؤں پر مترتب ہوئے اور وہ ان سے مرعوب رہے،

مگر دکھ کی بات تو یہ ہے کہ صلاح الدین نے مسلمانوں کی جو اجتماعی قوت پیدا کی وہ اس کے جانشین باقی نہ رکھ سکے، رفتہ رفتہ سلجوقی اور ایوبی خاندان ختم ہوئے، مگر اس گہرے بادل کے پیچھے سنہیں لکیریں اس طرح نظر آتیں کہ ان ہی کے کھنڈروں پر دولت عثمانیہ قائم ہوئی، جس کے حکمرانوں نے سرویا، بوسینا، بلغاریہ، والاچیا، ہنگری، پولینڈ، فرانس اور روس سے ٹکرا کر ایک ٹرکش امپائر بنالیا، جس کے علاقے یورپ میں تھریس، مقدونیہ، بلغاریہ، سلونیکا، البانیہ، ہنگری، بلغراڈ، اور کریمیا اور پھر ایشیا میں مصر شام عراق اور حجاز تک پھیلے ہوئے تھے، سلطان محمد فاتح نے تو قسطنطنیہ فتح کر کے بازنطینی امپائر کی بنیاد ہلادی، سلطان سلیمان اعظم کے نام سے تو یورپ کی سلطنتیں لرزتی تھیں، سلطان سلیم ثالث نے تو فرانس کے نپولین اعظم سے بھی ٹکر لی، سلطان عبد الحمید کے زمانہ میں عثمان پاشا نے روس سے ایسی بہادرانہ جنگ کی کہ وہ شیر پلونا کہلائے ان کارناموں سے مسلمانوں کا سر پھر اونچا ہوا، لیکن ان کے اندر بھی اختلافات پیدا ہوتے رہے، سلاطین معزول اور قتل کئے گئے، نادر شاہ نے اس پر حملہ کر کے اس کو کمزور کیا، مصر کی ماتحت ریاست ذوالقدریہ نے اس سے سرکشی کی، ان مسلمانوں نے صلیبی لڑائیوں کے زمانہ کے اپنے اختلافات کے برے اور ہولناک نتائج سے عبرت حاصل نہیں کی، اسی لئے یورپ کی عیسائی حکومتوں نے ان کے ساتھ وہی کیا جو صلیبی جنگ کے آغاز میں کیا تھا، انھوں نے مسلمانوں کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھایا، ان سے جنگ

کر کے انگریزوں نے قبرص پر قبضہ کر لیا، مصر کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیا، سوڈان پر لارڈ کچنر کا قبضہ ہو گیا، طرابلس، اٹلی کے زیر نگیں ہو گیا، پھر یورپ کے سامراجیوں نے بلقان کی جنگ چھیڑ کر ترکوں کے یورپی علاقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور جب ترکوں نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں کا ساتھ دیا تو ان کی شکست کے بعد حجاز، عراق اور فلسطین کو انگریزوں نے لے لیا، شام فرانس کے قبضہ میں آگیا، ایشیائے کوچک روس کو ملا، قسطنطنیہ اور آبنائے فاسفورس سب کی مشترکہ ملکیت میں آگئے، سلطان عبد الحمید کی خلافت ختم کر دی گئی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، ٹرکش امپائر سے عربوں کو جدا کر کے ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنائیں تاکہ ان کی قوتیں مجتمع نہ ہو سکیں، نجد، حجاز، یمن، عسیر، کجھ، امارات نواحی لتعہ، بحرین، کویت، عراق بشمول فلسطین و شام، مصر، مراکش اور سوڈان کی حکومتیں بنیں، مگر ان پر یورپ کی سامراجی قوتیں چھائی رہیں، ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو یہ یوروپین سامراجیت سے آزاد ضرور ہوئیں، مگر فرنگی میکاولیوں نے عراق کو اردن سے کاٹ دیا، یمن کے دو ٹکڑے کر دیئے لبنان کو عیسائیوں اور عربوں کے لئے وجہ تنازعہ بنا دیا، فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کرا دی، اور بیت المقدس پر اسرائیلیوں کا قبضہ کرا دیا، صلیبی جنگ میں اپنی شکست کا بدلہ ۷۳۲ برس کے بعد لیا،

یہ دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صلیبی اور اس قسم کی لڑائیوں سے سبق حاصل کرنے کے بجائے عرب مشرق وسطیٰ میں اسرائیلیوں سے برسرپیکار تو ضرور ہیں، مگر وہ وہی تاریخ دہرا رہے ہیں جو صلیبی لڑائیوں کے موقع پر اس زمانہ کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی بیوفائی سے عمل میں آئی، جس طرح صلیبیوں نے مسلمانوں کے نفاق اور اختلاف سے فائدہ اٹھایا وہی فائدہ اسرائیلی اور یورپ کی سامراجی حکومتیں عربوں کے باہمی نفاق سے اٹھا رہی

ہیں، ۱۹۶۷ء میں عربوں کی شرمناک شکست کی بڑی وجہ اُن کی اخلاقی کمزوری، دینی قدروں پر تیشہ زنی، فکری انارکی اور چھوٹے معیار کے سامنے سپراندازی کے ساتھ ان کی سیاسی ابن الوقتی، علاقائی مفاد پرستی، اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے حکمرانوں کی خودغرضی بھی تھی، انھوں نے صلیبی محاربات پر مسلمانوں کی کامرانی اور کامیابی پر پانی پھیر دیا،

عربوں اور مسلمانوں نے اپنے قبلۂ اول بیت المقدس کو ۴۳۳ برس کے بعد اس لئے کھویا کہ ان کو خدا ترسی، ایمان پروری، زبان، دل اور عمل کی سچائی، اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی، انسان دوستی، عبادت، ریاضت اور مودت کی جو تعلیم دی گئی تھی، ان سب سے دور ہو کر نسلی اور علاقائی امتیازات اور باہمی تعصبات کے رذائل میں مبتلا ہوئے تو گرے اور گرتے چلے گئے، صلاح الدین ایوبی نے یہ عملی نمونہ پیش کیا تھا، کہ وہ رات کو راہب اور دن کو شہسوار بن کر یورپ کو اپنے سامنے جھکا سکتا ہے، اپنی سیرت کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، ایمان کی طہارت سے اس نے جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنے کا جو درس دیا تھا، اس کو مسلمان بھول گئے اور اس وقت یورپ کی سامراجی قوتوں کے سامنے راکھ کے ڈھیر بنے ہوئے ہیں، عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی کی روحیں ان کو پیام دے رہی ہیں کہ وہ اب بھی یورپ کی نگاہوں میں رازکن فکان، معمار جہاں، آخری نبوت کے ارمغان اور ایشیا کے پاسبان ہو سکتے ہیں، اگر وہ متحد ہو کر اسلامی اور ملی زندگی بسر کرنا سیکھیں۔

قرآنِ کریم

اور

اس کی نسبت سے بعض علوم کی ایجاد و ترقی

از ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

قرآن کریم کی نسبت سے فن خطاطی کو بڑا عروج و نشو و نما ملا، دراصل خطاطی و خوشنویسی کا فن ہمارے رسم خط کی تخصیص ہے، ورنہ دنیا کے تمام رسم خطوں کا مقصود محض کسی بات کا ضبط تحریر میں لے آنا ہے، یہ اور بات ہے کہ ہر شخص کی تحریر مختلف ہونے کی وجہ سے تحریر کے ہزاروں لاکھوں نمونے ہر زبان میں مل جائیں گے، لیکن ان میں بذات خود کوئی ایسا ہنر نہ ہو جو دلکشی کا موجب ہو، اس کے برخلاف عربی، فارسی رسم خط کی بدولت خطاطی اور خوشنویسی کا فن وجود میں آیا اور اس میں وسعت پیدا ہوئی یہاں تک کہ یہ فن نہایت وقیع علم قرار پایا، ذیل میں اس کی کچھ تفصیل افغانی عالم عبد الحئی حبیبی کی کتاب خطاطی کی مدد سے پیش کی جاتی ہے،

خط عربی ابتداءً سادہ نسخ تھا، چنانچہ یہی سادگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین میں موجود ہے، منجملہ ان کے حضورؐ کا نامۂ مبارک ہے جو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام ہے اس فرمان کا اسکاٹ لینڈ کے مستشرق ڈنلوپ نے انکشاف کیا تھا اور جنوری ۱۹۴۰ء کے ایشیاٹک سوسائٹی انگلینڈ کے مجلہ میں شائع کیا تھا، دوسرا نامۂ مبارک نبویؐ قبط کے بادشاہ مقوقس کے نام ہے، جو مصر کے کلیسا میں ملا تھا اور پہلی بار مجلہ الہلال قاہرہ ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا، حضورؐ کا تیسرا

زبان منذر بن ساوی کے نام ہے جو دمشق میں حاصل ہوا تھا اور جرمنی کے مجلہ Zdmg
ج ۱۱، سال ۱۸۶۷ء میں پہلی بار چھپ چکا تھا، اسی خط میں دو کتبے مدینہ میں کوہِ سلع کے جنوب
میں برآمد ہوئے ہیں، یہ ابتدائی خط نسخ رفتہ رفتہ خط کوفی سے نزدیک تر ہو گیا، چنانچہ اس
خط نسخ ممزوج بکوفی کا قدیم ترین نمونہ قاہرہ میوزیم میں محفوظ ہے جو ایک لوحِ سنگِ مزار پر ہے،
یہ ۳۱ھ میں مرتب ہوا تھا، دوسرا قدیم کتبہ ۷۲ھ کا ہے جو بیت المقدس میں پایا جاتا ہے،
اسی طرح اموی دور کی بعض تحریرات اسی خط میں برآمد ہوئی ہیں، ان میں سے ایک تحریر
ولید بن عبدالملک (۸۶ - ۹۶ھ) کے عہد کی درخت بردی کے پوست پر لکھی ہوئی
ملی ہے جو بسم اللہ الرحمن الرحیم اور کلمۂ توحید کو شامل ہے اور اس کا یونانی ترجمہ بھی موجود ہے،

یہ سادہ ابتدائی خط جو نسخ اور نسخ ممزوج بکوفی کے طرز میں ملتا ہے، رفتہ رفتہ تزئینی
شکل اختیار کرتا ہے، اس رجحان کے پیدا کرنے میں دو عوامل خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں،
اول یہ کہ انسان طبعی طور پر اچھی اور دلکش چیزوں کو پسند کرتا ہے، اس لیے خط میں
حسن و ہنر اور تزئین پیدا کرنے کا رجحان طبعی تھا، دوم ایک تاریخی بات یہ ہوئی کہ دورِ عباسیہ
میں جب حکومت کا حلقہ وسیع ہوا تو اہلِ عرب کو دوسری قوموں کے ہنر آرائش و مصوری
کے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ ان سے کافی متاثر ہوئے، چنانچہ ابن ندیم، طبری اور مسعودی
کی روایت کے بموجب بامیان، کابل، داور، بست وغیرہ کے معابد سے مرصع بتوں کو
بغداد لے گئے، اور وہاں عرصے تک خلیفہ کے محل میں ان کی نمائش ہوتی رہی، لیکن چونکہ اسلام
تصویر کشی کی اجازت نہیں دیتا،

لا تدخل الملائکۃ بیتاً   جس گھر میں کوئی کتا یا تصویر ہو
فیہ کلب او صورۃ،   اس میں فرشتے نہیں داخل ہوتے،

کے در آید فرشتہ تا نکنی   سگ ز در دور و صورت از دیوار

اس لیے محلوں کی آرائش میں تصویروں سے بڑی حد تک احتراز ملتا ہے، ابوالفضل بیہقی
نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ شاہزادہ مسعود غزنوی نے ہرات کے باغ عدنانی میں ایک محل تیار
کرایا تھا جس کی دیواریں تصویروں سے مزین تھیں، لیکن جب سلطان محمود کو خبر ہوئی
تو اس نے سخت باز پرس کی، گویا عام طور سے دورِ اسلامی میں عمارتوں کی آرائش میں
تصویروں کا حصہ نفی کے برابر تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نقاشوں، خطاطوں اور
مصوروں کی توجہ خط اور نقش و نگار کی طرف زیادہ بڑھی اور اسی رجحان نے خطاطی میں
تزئینی رنگ بھرا،

دورِ عباسی میں علم و ہنر نے ترقی کے بڑے منازل طے کیے، خطاطی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھی،
خلیفہ مامون کو خطاطی سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس کے دربار میں خطاطوں کی بڑی
قدر دانی ہوئی، اس کے دور کا سب سے بڑا خطاط احمد بن ابو خالد احول تھا جس نے
خط عربی کے لیے قواعد منضبط کیے، اور جس کی وجہ سے خطاطی کے بہترین نمونے معرض وجود
میں آئے، وزیر یحییٰ برمکی کو بھی خطاطی سے لگاؤ تھا، وہ احمد بن ابو خالد احول کو بہت عزیز رکھتا تھا،
اسی دور کا ایک دوسرا وزیر فضل بن سہل سرخسی ذوالریاستین تھا، جس کی توجہ سے قلم الریاستی
رواج پذیر ہوا اور یہی خط ثلث و محقق، رقاع، غبار کا مبدأ ثابت ہوا، احمد احول کے
حسن خط کا اندازہ ابوبکر الصولی کی کتاب ادب الکتاب کی ایک تحریر سے ہو سکتا ہے،
وہ لکھتا ہے کہ احمد احول کی خطاطی کے نمونے مامون کی طرف سے قسطنطنیہ بھیجے گئے، وہاں
وہ صومعہ کے دروازے پر آویزاں کیے گئے تاکہ لوگ اس کا نظارہ کر سکیں، اواخر
تیسری صدی میں خلیفہ المعتمد نے بزنطین کے بادشاہ کے نام ایک خط بھیجا، یہ خط خطاطی کا

ایسا بہتر نمونہ تھا کہ بادشاہ نے جواب میں لکھا کہ عرب کی کسی چیز پر سوائے اس دلکش تحریر کے مجھے رشک نہیں آتا، تیسری صدی کے خط کی ایک بہترین یادگار ایک کلام مجید ہے جس کی کتابت ۲۷۲ ہجری کی ہے اور جو دمشق کے میوزیم میں محفوظ ہے، یہ قرآن کوفی خط میں ہے جس کو کوفی تزیینی کہنا چاہیے، دمشق ہی میں ایک قرآن کا قدیم تر نسخہ ہے جو ۲۷۰ ہجری میں وقف کیا گیا ہے، اس کا خط بھی کوفی تزیینی ہے، مشہد کے آستانہ قدس میں ایک قرآن ہے جو ۳۲۷ ہجری میں لکھا گیا ہے اور ایران میں سب سے قدیم نسخہ ہے، اس کا خط کوفی مائل بہ نسخ ہے، اسی کتاب خانے میں سلطان محمود کے دبیر ابوالحسن عراقی کا وقف کردہ نسخہ خط نسخ مائل بہ ثلث میں ہے، چوتھی صدی میں ایک اور تزیینی خط وجود میں آیا جس کو ابن ندیم پیرآموز کے نام سے یاد کرتا ہے، اس خط میں قرآن لکھے جاتے تھے، چنانچہ آستانہ قدس کے مجموعہ میں قرآن کا ایک ورق موجود ہے، ایک دوسری کتاب اسی خط میں صفات الشیعہ تالیف شیخ صدوق (۳۶۰ھ) ہے جس کا کاتب نصر بن عبداللہ قزوینی اور سال کتابت ۳۹۱ ہجری ہے، یہ کتاب تہران کے ایک شخصی کتب خانہ میں پائی جاتی ہے، لیکن اس سے خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس دور میں کوئی سادہ آمیختہ یا نسخ کا رواج نہ تھا، آستانۂ قدس مشہد کے گنجینۂ قرآن میں ایک قرآن ہے جس کو سلطان محمود کے وزیر ابوالقاسم منصور بن محمد ہروی نے ۳۹۳ ہجری میں وقف کیا تھا، یہ قرآن خط کوفی آمیختہ بہ نسخ میں ہے اور اس میں نقطہ، تشدید اور حرکات وغیرہ کا باقاعدہ اہتمام ملتا ہے، اس التزام کے اور نسخے مل جاتے ہیں۔ مثلاً گنجینۂ قرآن مشہد کا نسخہ ۴۱۸ھ جس کو ۴۲۱ھ میں ابوالبرکات رازی نے وقف کیا تھا، یا قرآن کا وہ نسخہ جو عیسیٰ بن عبداللہ بلخی کا مکتوبہ ہے اور میلان کے کتاب خانے میں محفوظ ہے (۱۷۲۴) ان نسخوں میں خط کی تزیین پر زیادہ توجہ نہ تھی۔ لیکن عثمان بن حسین وراق غزنوی کے خط میں جو قرآن ۴۶۶ھ کا مکتوبہ ہے، اور

گنجینۂ قرآن مشہد میں موجود ہے، کوفی خط کی اعلیٰ تزیینی شکل ہے، اس قرآن کا ترقیمہ خط نسخ میں ہے اور خطاطی کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس سے ظاہر ہے کہ عثمان غزنوی کوفی اور نسخ دونوں طرز میں بڑی مہارت رکھتا تھا، پانچویں صدی کے وسط کے بعد کے قرآن کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں تزیینی خط کے علاوہ اعلیٰ درجے کی تذہیب و تنقیش بھی موجود ہے، اس سلسلے کے چند نسخے یہ ہیں:

(۱) نسخۂ قرآن خط کوفی، کاتب محمد بن عثمان وراق غزنوی، تاریخ وقف ۴۹۶ھ (ص ۹۶ھ

(۲) نسخۂ قرآن خط کوفی مایل بہ پیرآموز مذہب و منقش مجموعۂ چیسٹربیٹی۔

(۳) نسخۂ قرآن خط کوفی با تذہیب و تنقیش نفیس و اعلیٰ کتاب خانہ ملی پیرس مکتوبہ ۵۰۵ھ

(۴) نسخۂ قرآن خط کوفی با تذہیب، کاتب ابوبکر بن احمد بن عبیداللہ غزنوی موزۂ مصر تاریخ کتابت ۵۶۶ھ

چھٹی صدی ہجری ہی میں خط نسخ میں ریحان، رقاع اور توقیع کی آمیزش کی بہترین مثال قرآن مجید کے اس نسخے سے فراہم ہوتی ہے جو محمد بن عیسیٰ بن علی نیشاپوری نے ۵۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین محمد بن سام کے لیے تیار کیا تھا اور ایران باستان کے میوزیم میں موجود ہے، تزیینی خط عام کتابوں میں بھی ملتا ہے، یہاں تک کہ قدیم فارسی مخطوطوں میں بھی یہی اہتمام کیا گیا ہے، فارسی کا قدیم ترین مخطوطہ کتاب الابنیہ عن حقایق الادویہ بخط اسدی طوسی مکتوبہ ۴۴۷ ہجری وینا میں موجود ہے، اس کا خط کوفی ہے جس میں کسی قدر نسخ کی آمیزش بھی ہے، دوسرا قدیم مخطوطہ شرح تعرف مکتوبہ ۴۷۳ ہجری کراچی میوزیم میں ہے، یہ خط متمایل بہ نسخ ہے، اسی خط میں کتاب المتعلمین فی الطب کا نسخہ ہے جس کی کتابت ۴۷۸ھ کی ہے اور نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، لیکن ترجمان البلاغہ کا جو نسخہ ترکی میں ہے اور جو ۵۰۷ ہجری کا مکتوبہ ہے اس کا خط شبیہ بکوفی ہے،

اور کتاب الابنیہ سے ملتا جلتا ہے، ترجمان البلاغہ کا کاتب اردشیر بن دیلم سپار اسدی طوسی یعنی کاتب کتاب الابنیہ کا دوست تھا، بہرحال اگرچہ دونوں نسخوں کی کتابت میں ۱۶ سال کا فرق ہے، لیکن دونوں کا خط کافی ملتا جلتا ہے اور دونوں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بجائے کلمات بنام بخشایندہ بخشایش گر آئے ہیں اور ان کا خط اتنا مشابہ ہے کہ ان میں فرق کرنا دشوار ہے،

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی کے اکثر فارسی کے نسخوں میں دو قسم کے خط نظر آتے ہیں، اول خط نسخ با آمیزش کوفی، اس سلسلے کی مثالیں یہ ہیں:۔ کتاب ترجمان البلاغہ (۵۰۷ھ) المختصر من کتاب الوقف تحریر عبد اللہ بن علی (۵۰۶ھ کتاب خانہ مرحوم پروفیسر محمد شفیع لاہور) اور وامق و عذرائے عنصری (حدود ۵۰۰ھ مکشوفہ پروفیسر محمد شفیع۔ دوسری قسم کے مخطوطے نسخ میں ہیں، جن میں کوفی کی آمیزش نہیں ہے، اس کی مثالیں نسخہ ہدایت المتعلمین فی الطب (۴۷۸ھ) (نسخہ برٹش میوزیم) اور تفسیر ابو بکر عتیق سورآبادی (۵۲۸ھ) (نسخہ انڈیا آفس)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ خط کوفی تزئینی کا استعمال عمارتوں میں، اکثر قرآن اور دوسری کتابوں کے نسخوں میں تیرہویں صدی تک برابر ملتا ہے، لیکن اسی دور میں دوسرے خطوط بھی برابر استعمال میں آئے ہیں، چنانچہ رقاع، ریحان، ثلث و محقق کے نمونے بھی برابر ملتے ہیں، اور خط نسخ اس قدر پختہ ہو گیا کہ اس کا شمار بھی ہنر اور تزئین میں ہونے لگا، اس طرح کی بہترین مثال عبد اللہ صیرفی کے قرآن کی ہے جو ۷۰۲ھ میں لکھا گیا اور گنجینۂ قرآن مشہد میں موجود ہے،

اسلامی دور کی خطاطی کی سات سو سالہ تاریخ بڑی توجہ کی حامل ہے، اس کے ابتدائی دور میں نسخ سادہ کا رواج تھا، پھر نسخ آمیختہ بکوفی، کوفی سادہ، کوفی آمیختہ بنسخ، کوفی تزئینی، نسخ تزئینی کا رواج ہوا، لیکن ان میں جو ذرا ذرا سا فرق تھا، اس کے اعتبار سے ان کے الگ الگ نام ہوئے جن کی تعداد پچاس تک پہونچتی ہے، لیکن اوائل تیموری دور میں صرف چھ

خط زیادہ متداول تھے جیسا کہ اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

نگار من خط خوش می نویسد
بغایت خوب و دلکش می نویسد
مناشیر و محقق نسخ و ریحان
رقاع و ثلث ہر شش می نویسد

اسی درمیان میں خط تعلیق کا مزید اضافہ ہوا چنانچہ جامی لکھتے ہیں:۔

کاتبان را هفت خط باشد بطرز مختلف
ثلث و ریحان و محقق نسخ و توقیع و رقاع
بعد ازان تعلیق آن خط است کش اہل عجم
از خط توقیع استنباط کردند اختراع

چودھویں صدی کے نصف میں نسخ و تعلیق کی آمیزش سے مشرق کا سب سے متداول خط نستعلیق وجود میں آیا جس کی ایجاد کا سہرا میر علی تبریزی (۷۹۰ھ) کے سر ہے جیسا کہ سلطان علی مشہدی لکھتا ہے

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی است
واضع الاصل خواجہ میر علی است
وضع فرمود او ز ذہن دقیق
از خط نسخ و ز خط تعلیق

آخر میں بعض کاتبوں نے شکستہ آمیز تحریر شروع کر دی جس نے بعد میں فنی شکل اختیار کی اور شفیعای ہروی کے نام پر اس کا نام خط شفیعہ پڑ گیا، یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ اگرچہ نستعلیق خط کاملاً فارسی خط ہے، لیکن اس خط میں بھی قرآن کے اچھے نسخے موجود ہیں اور قرآن کی نسبت سے اس خط کی اپنی الگ اہمیت ہے، اسی طرح خط شکستہ میں بھی قرآن کے نسخے مل جاتے ہیں، اس لئے قرآن کے خط کے ضمن میں اس خط کا ذکر بے محل نہیں۔

ایک نہایت قابل توجہ بات یہ ہے کہ بابر نے ایک عجیب و غریب خط ایجاد کیا، جو خط بابری کے نام سے مشہور ہے، تزک بابری اور اکبری دور کی اکثر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے اس اختراعی خط میں قرآن لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا تھا، اس نسخے کا پتہ نہیں کہ کہاں ہے، البتہ مشہد کے گنجینۂ قرآن میں بقول گلچین معانی کے وہ قرآن جو زیر شمارہ (۵۰) محفوظ ہے اور جو شاید سلطان

حسین صفوی کے وقف نامہ ۱۱۱۹ ہجری کے اعتبار سے شاید امام ہشتم کا خط ہے، اور اصل خط بابری ہیں ہی، مگر یہ خیال شبہ سے خالی نہیں، اس لیے کہ اس خط کے حروف تہجی محمد طاہر بن قاسم کی تالیف عجائب الطبقات (۳۴۵-۱۳۴۶) میں درج ہیں اور یہ حروف خط بابری سے مختلف ہیں۔

قبلا عرض ہو چکا ہے کہ قرآن مجید کی آرایش و زیبایش پر جتنی توجہ ہوئی ہے وہ کسی زبان کی ایک کتاب کا کیا ذکر سارے ذخیرۂ کتب عالم پر شاید ہی ہوئی ہو، یہ خطاطی آرایش کے علاوہ ہے اور جیسا کہ سطور بالا سے واضح ہے کہ ہزاروں خطاطوں نے قرآن مجید پر اپنا کمال ہنر صرف کیا ہے، اس کے نتیجے میں خود قرآن کے ایسے ایسے نادر و کمیاب نمونے موجود ہیں کہ محض ان ہی کی روشنی میں خطاطی کی صحیح تاریخ مرتب ہو سکتی ہے، خطاطی کے جملہ اقسام میں قرآن مجید کے نسخے موجود ہیں، چونکہ ہر خطاط کا خط دوسرے سے الگ ہوتا ہی ہے چاہے قسم خط کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہوں، اس لیے قرآن مجید کے قلمی نسخوں سے قسم خط کے علاوہ الگ الگ خطاطوں کے خط کی انفرادی خصوصیات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے،

خطاطوں کے علاوہ ہزاروں نقاش اور مذہب بھی قرآن مجید کے قلمی نسخوں کی تہذیب و نقش کشی میں برابر کے حصہ دار تھے، ان میں سے بعض ہنرمندوں کا نام مل گیا ہے، لیکن عام طور پر قرآن پر کام کرنے والے اپنے نام و تاریخ کے ذکر سے گریز کرتے ہیں، اس لیے خطاطوں کے مقابلے میں نقاشوں اور مذہبوں کے نام نسبتہً کم معلوم ہیں،

قرآن مجید کے نسخوں کی انفرادیت کا بڑا مدار فن خطاطی اور نقاشی پر ہے، لیکن ان کے علاوہ بعض اور امور قرآن کے نسخوں کی زینت کا سبب بنتے ہیں، اور قرآن مجید کی ترتیب و تہذیب میں ان کا بجا طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے، اس سلسلے کی پہلی چیز سیاہی ہے، عام سیاہی کے علاوہ قرآن میں جواہرات اور قیمتی دھات سے مرکب سیاہی کا استعمال ہوا ہے، یشب، یاقوت،

مروارید، صدف، زر، سیم کی آمیزش سے عمدہ اور دیرپا سیاہی بنائی جاتی تھیں، اس میں نئی رنگ کی سیاہی تیار ہوتی تھی اور ہر رنگ اپنی الگ کشش رکھتا تھا، قرآن کے سینکڑوں نسخے مل جائیں گے جن میں عام سیاہی کا مطلق استعمال نہیں ہوا ہے، اور عام سیاہی بھی آجکل کی سیاہی سے کئی گنا زیادہ پختہ اور دیرپا ہوتی تھی، ہزار سال پرانے نسخے دیکھیں، ان کی سیاہی ایسی روشن ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کا نسخہ ہے، اور موجودہ دور کی سیاہی اسکے اعتبار سے جس طرح غیر وقیع ہے، اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ تیس چالیس سال پہلے کی تحریریں پڑھنے کے قابل نہیں رہ گئی ہیں، بہرحال سیاہی کے اعتبار سے قرآن مجید کے نسخوں میں بڑا اہتمام ملتا ہے، پرانے دور میں سیاہی بنانا بہت اہم پیشہ سمجھا جاتا تھا، غرض کہ قرآن میں سیاہی کی جو اقسام استعمال ہوئی ہیں وہ خود تحقیق کا موضوع ہو سکتی ہیں،

قرآن کی تہذیب و تنقیش کے ساتھ بعض التزامی امور کی ایسی دقیق پابندی ملتی ہے کہ دیکھنے والا حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، بعض قرآن ایسے خفی حروف میں لکھے گئے ہیں کہ معدودے چند صفحے میں پورا قرآن سمو دیا ہے، اور جب جلی حرف کے نسخے دیکھیں تو پورے صفحے میں چند سطریں ملیں گی اور قرآن کا حجم حیرت انگیز ہوگا، کبھی سارے قرآن میں یہ پابندی ملتی ہے کہ اس کی ساری سطریں ایک خاص حرف سے شروع ہوئی ہیں، اسی طرح کی اور بھی پابندیاں ہیں جن کا احاطہ قرآن کے نسخوں کے دقیق مطالعہ کا متقاضی ہے، قرآن کے حاشیے کی آرایش و زیبایش میں جو فن صرف ہوا ہے وہ الگ موضوع ہے، جس کی کماحقہ بحث بڑا وقت اور بڑی بصیرت چاہتی ہے، قرآن کی تہذیب میں ایسا تنوع ہے جو شاید ایک زبان کی ساری مصور و مذہب کتابوں میں نہ ملتا ہوگا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"، "عنوان سورہ" اور آیات کا نقش و نگار بھی بہت دلکش اور زیبا ہوتا ہے، ان کے علاوہ سطر کشی بھی ایک الگ فن ہے، سطروں کے درمیان

کا جو اصل ایک صفحہ پر ہوگا وہی پورے کلام مجید میں برقرار رہیگا، یہی حال سطروں کی موٹائی کا بھی ہے کہ پورے متن میں کسی قسم کا فرق نہ ملے گا۔

قرآن مجید کی کتابت میں خطاطوں اور خوشنویسوں کے علاوہ علما و فضلا و صوفیہ یہاں تک کہ بادشاہوں، امیروں اور دوسرے لوگوں نے کافی حصہ لیا تھا، بادشاہوں میں سلطان ابراہیم غزنوی (م: ۴۹۲ھ) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سال کلام مجید کے دو نسخے تیار کرتا، ایک مکہ معظمہ کے لئے اور دوسرا مدینہ طیبہ کے لئے، معلوم نہیں کہ اس نے کتنے نسخے لکھے ہوں گے لیکن اب ان میں سے کسی کا پتہ نشان نہیں، سلطان ناصر الدین محمود (م: ۶۶۴ھ) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے ذاتی مصارف کا ذریعہ مصحف کریم کی کتابت تھی، (برنی) مؤلف طبقات اکبری کے بقول وہ سال میں دو نسخے تیار کرتا، اس کے بھی ہاتھ کا کوئی نسخہ موجود نہیں، البتہ ابن بطوطہ نے اس کے ہاتھ کا ایک نسخہ اپنے قیام دہلی بعد ۷۳۵ ہجری دیکھا تھا، اس نے لکھا ہے کہ قاضی کمال الدین[1] نے قرآن کا ایک نسخہ جو سلطان ناصر الدین محمود کے خط میں تھا مجھے دکھایا اس کی کتابت محکم اور استادانہ تھی (رحلہ ج۲ ص ۲۷) افسوس کہ اب سلطان ناصر الدین کے نسخوں میں کوئی نسخہ نہیں پایا جاتا،

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ نے اپنے ایجاد کئے ہوئے خط بابری میں ایک نسخہ مکہ معظمہ روانہ کیا تھا، آستانِ قدس مشہد میں ایک نسخہ کچھ مختلف خط میں ہے، چنانچہ آقائے گلچیں معانی اسے بابر ہی کا نسخہ قرار دیتے ہیں، مگر استاد حبیبی کی رائے اس کے برعکس ہے۔

سلطان اورنگزیب نے بھی مصحف شریف کی کتابت کی ہے۔ ماثر عالمگیری کی روایت کے بموجب ایک نسخہ شہزادگی کے زمانے میں لکھا تھا اور اسے مکہ مکرمہ روانہ کیا تھا، تخت نشینی کے بعد دوسرا نسخہ لکھا اور مدینہ منورہ بھیجا۔ اس نسخے کی جلد بندی اور جدول کی زیب و زینت

---

[1] محمد شاہ تغلق کے دور کے قاضی دہلی،

پر مبلغ سات ہزار روپے صرف ہوئے، ہندوستان کے کتاب خانوں میں اورنگ زیب کی طرف منسوب قرآن کے نسخے ملتے ہیں، مگر خود اس نے لکھا ہے کہ میں نے ایک دو مصحف لکھے ہیں ان میں نام نہیں لکھا، نہ تاریخ لکھی، صرف رضائے الٰہی کی غرض سے لکھا ہے۔ (رقعات عالمگیری) اس قول کی روشنی میں عام نسخوں کی صداقت مشتبہ ہو جاتی ہے۔

دارا شکوہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے ایک نسخہ کا پتہ عزیز باغ لائبریری حیدرآباد (دکن) میں بتایا گیا ہے (ستارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر ص ۸۶۸) اس کے ہاتھ کا ایک پنج سورہ اور دو پندرہ سطرو کا نسخہ وکٹوریا میموریل ہال کلکتہ میں بتایا گیا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (م: ۱۰۳۷ھ) نسخ اچھا لکھتا تھا، اس کے ہاتھ کا ایک نسخہ جو سورہ انعام اور سورہ مائدہ کو حاوی ہے، سالار جنگ کے کتاب خانے میں موجود ہے، اس کی کتابت ۱۰۲۳ ہجری میں ہوئی تھی، راقم کے توسط سے اس کے ترقیمہ کا عکس "نذر ذاکر" میں چھپ گیا ہے،

ظاہر ہے کہ قرآن کے نسخوں میں متن کے اعتبار سے کوئی ندرت نہیں ہوتی، البتہ ایسے نسخے جو کسی بڑی شخصیت سے منسوب ہیں، یا قدیم ہیں، یا کسی اچھے خطاط کی یادگار ہیں، یا خطاطی کے اچھے نمونے ہیں، یا جن کی تہذیب و تنقیش کافی دلکش ہے، وہ زیادہ اہم نسخے قرار دے جاتے ہیں، دنیا کے کتاب خانوں میں قرآن مجید کے کتنے اہم نسخے ہونگے ان کا احاطہ کرنا اور ان پر سیر حاصل بحث کرنا میرے دائرہ عمل سے باہر ہے، میری رسائی چند کتاب خانوں تک ہے اور ان میں جو قابل توجہ نسخے موجود ہیں ان کی بابت ایک مختصر یادداشت پیش کی جاتی ہے، اس یادداشت کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآن مجید کے اہم نسخوں کی تلاش و جمع آوری اور ان کے خط وغیرہ کے دقیق مطالعہ کی ضرورت کا صحیح احساس پیدا ہو، اس لئے کہ جیسا عرض ہو چکا ہے خطاطی کی تاریخ کتب سے مستند ماخذ

یہی نسخے فراہم کرتے ہیں، اس سے مزید اندازہ ہوگا کہ اہل اسلام نے اس کتاب کی آرائش میں کتنا ہنر صرف کیا ہے،

قابل ذکر یہ ہے کہ جس طرح اور دوسری کتابیں دستبرد زمانہ کی نذر ہوچکی ہیں، قرآن کے نسخے بھی ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں تلف اور برباد ہوچکے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ قرآن انسانی ہنر کا شاہکار ہے اور اس پر ماہرین نے جتنی توجہ کی کسی اور چیز پر صرف نہیں کی، لیکن افسوس ہے کہ اس کے نسخوں کی حفاظت میں عام مسلمانوں کی وہ خصوصی توجہ نہیں رہی جسکا یہ صحیفہ مستحق تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن کے قدیم نسخے عام طور پر نہیں ملتے،

قرآن مجید کے اہم نسخے قرآن کی تدوین اور اشاعت حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں ۲۵ ہجری کے اواخر سے شروع ہوئی اور ۳۰ھ تک جاری رہی، قرآن کے یہ نسخے مصحف کہلاتے تھے، ان کی تعداد میں اختلاف ہے، ان میں ایک خود حضرت عثمانؓ کے پاس رہا باقی نسخے مدینہ، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، یمن اور بحرین بھیجے گئے، تاریخی روایات میں متعدد مصاحف کا تذکرہ ملتا ہے جن کی شہرت حضرت عثمانؓ کے شائع کردہ مصاحف کے اصل نسخوں کی حیثیت سے تھی، لیکن کسی قدیم مصحف کو اصل نسخۂ عثمانی کی حیثیت سے مشہور کر دینا بہت آسان ہے، مگر اس کی اصلیت کا ثابت کرنا نہایت دشوار امر ہے، بہر حال جن مصاحف کا ذکر تاریخی روایات میں ملتا ہے ان پر ایک عالمانہ مضمون ابو محفوظ الکریم معصومی نے مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا، اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے،

مصحفِ خاص یہ نسخہ وہ ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے سامنے تھا، اس نسخے کے بارے میں سب سے قدیم اطلاع عمرۃ بنت قیس العدویہ کی ہے جو احمد بن محمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ کی سند سے کتاب الزہد[1] میں درج ہے، عمرۃ العدویہ شہادت

[1] ص ۱۲۸ – ۱۲۷

کے بعد ہی مدینہ پہنچی تھیں اور انھیں مصحف خاص دیکھنے کا موقع ملا تھا، روایت اس طرح پر ہے،

قرأینا مصحف الذی ھو فی	ہم نے ایک کمرے میں وہ مصحف دیکھا،
حجرۃ، فکانت اوّل قطرۃ قطرت	حضرت عثمانؓ کے خون کا پہلا قطرہ
من دمہ علی ھذہ الآیۃ :	اس آیت پر پڑا تھا، اللہ ان لوگوں
فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع	کے لئے کافی ہے اور وہ سننے، جاننے
العلیم، قالت عمرۃ فما مات	والا ہے، حضرت عمرۃؓ فرماتی ہیں کہ قاتلوں
منھم رجل سویا،	میں سے کوئی تندرست اور درست حال میں نہیں مرا،

بعض بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مصحف انہی ایام میں تلف ہوگیا تھا لیکن دوسری اور تیسری صدی کے ایک مشہور محقق ابو عبید القاسم بن سلام (۱۵۰ – ۲۲۳) نے کتاب القرآت میں بیان کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مصحف میں نے دیکھا ہے جو بعض امراء کے خزانے میں محفوظ تھا، یہ نسخہ شہادت کے موقع پر ان کے سامنے تھا اور اس[1] پر خون کے دھبے تھے،

تیسری صدی کے اواخر میں ابن قتیبہ دینوری (م: ۲۷۶) نے اطلاع دی کہ قرآن کریم کا وہ نسخہ خالد بن عثمان کے پاس تھا، پھر اس کی اولاد کے پاس رہا، آخر میں مشائخ شام کے ذریعہ اطلاع ملی کہ اب وہ طرسوس میں ہے،

جامع عتیق مصر کا نسخہ مقریزی (م ۸۴۵) کی روایت کے بموجب ایک عراقی تاجر مسعود بن سعد بن سعید کے ذریعے یہ نسخہ عباسی خلیفہ المقتدر (م ۳۲۰) کے خزانے سے حاصل کیا گیا اور پھر یکم ذی قعدہ ۳۷۸ھ کو جامع عتیق کے نام وقف ہوا، یہ حضرت عثمانؓ کا مصحف

[1] خون کے دھبے کی جگہ پر ختم سب سے زیادہ سورہ والنجم پر تھے (مجلد ۱۲ ع)

خاص تھا اور اس پر خون کے دھبے تھے، وقف نامہ علامہ مقریزی کے حوالے سے درج ہے، لیکن نسخہ کی خصوصیت نہیں بیان ہوئی، بعض لوگ اس کی صداقت کے منکر ہیں، لیکن آٹھویں صدی ہجری کے ایک مصری مورخ محمد بن عبدالوہاب معروف بہ ابن المتوج (م ۷۳۰) کے نزدیک اس کی صداقت میں کچھ شبہ نہیں، مصر کے دار الکتب المصریہ کی فہرست ج امیں زیر شمارہ ۳۹ جو قرآن مجید مذکور ہے، فہرست نگار کا خیال ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کا ذکر مقریزی نے الخطط میں کیا ہے، اس خیال کی صحت میں اس کو مصاحف عثمانی میں شمار کیا جاسکتا ہے،

مدرسہ فاضلیہ مصر کا نسخہ۔ چھٹی صدی میں یہ نسخہ قاضی عبدالرحیم بیسانی (م: ۵۹۶) کو دستیاب ہوا، یہ مصحف عثمانی تھا، قاضی موصوف نے تیس بتیس ہزار دینار میں اس کو حاصل کیا تھا اور مدرسہ فاضلیہ جس کو انھوں نے ۵۸۰ھ میں قائم کیا اس کے کتب خانے میں محفوظ کر دیا تھا، نویں صدی ہجری میں مقریزی کے عہد میں کتاب خانے میں نادر کتابیں تلف ہو چکی تھیں مگر یہ نسخہ باقی رہ گیا تھا،

اندلس کا نسخہ۔ قرطبہ کی جامع مسجد میں ایک مصحف چھٹی صدی کے وسط تک موجود تھا، جس کے متعلق مشہور رہا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے دست مبارک کا نوشتہ ہے، ابن خلدون کی روایت کے بموجب یہ مصحف بنو امیہ اندلس کے خزانے میں تھا، وہاں سے ملوک الطوائف کے پاس پہنچا، آخر میں موحدین کے خزانے میں آیا، ۶۴۶ ہجری میں السعید علی بن المامون جب تلمسان کے قریب قتل ہوا تو السعید کے خزانے سے یہ مصحف ابن زیان کے قبضہ میں آیا، ۔ ۔ میں ابوالحسن المرینی کا قبضہ جب تلمسان پر ہوا تو ابن زیان کے خزانہ کے ساتھ یہ مصحف بھی المرینی کے قبضہ میں آیا، ابن مرزوق نے مزید اضافہ کیا ہے کہ ابوالحسن مرینی سے پرتگالیوں

کے پاس یہ مصحف پہنچ گیا لیکن آخر میں ایک تدبیر کی گئی اور یہ نسخہ مرینی کے پاس واپس آگیا،

مسجد قرطبہ میں مصحف کے چند ورق۔

ابن فضل اللہ العمری نے مسالک الابصار (۷۴۰) میں مسجد قرطبہ کے ذکر میں ایک مصحف کا تذکرہ کیا ہے جس کے چار ورق حضرت عثمانؓ کے خود نوشت مصحف کے تھے، یہ اوراق خون آلود تھے،

جامع اموی دمشق کے نسخے

شام میں دو نسخوں کا پتہ چلتا ہے اور دونوں جامع بنی امیہ دمشق میں مختلف زمانوں میں تھے، ان میں قدیم تر نسخے کا ذکر ۵۰۷ ہجری سے ملتا ہے، امیر مودود فرمان روائے موصل اپنے قیام دمشق کے زمانے میں ہر جمعہ کو مصحف عثمانی کی زیارت کرتا تھا، زیارت کے موقع پر ایک باطنی کے ہاتھ قتل ہو گیا۔

ایک دوسرے نسخے کی اطلاع مشہور سیاح ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴) کے ذریعہ ملتی ہے کہ مشرقی رکن کے محراب کے اندر ایک بڑا خزانہ ہے، اس میں وہ مصحف عثمان محفوظ ہے جو بلاد شام کو بھیجا گیا تھا، اسی مصحف کو ایک مغربی فاضل ابوالقاسم تجیبی نے ۷۰۶ ہجری میں اسی جگہ محفوظ پایا تھا، ابن مرزوق نے ۷۲۵ ہجری میں اس کو دیکھا تھا، مشہور سیاح ابن بطوطہ (رحلہ ج اص ۵۴) نے بھی لکھا ہے کہ مقصورہ کے بڑے خزانے میں حضرت عثمانؓ کا مصحف شام موجود ہے اور ہر جمعہ کو بعد نماز خزانہ کھلتا ہے اور مصحف کی زیارت ہوتی ہے، ابن فضل اللہ العمری اس کو حضرت عثمانؓ کے خط میں بتاتے ہیں، علامہ شبلی کا بیان ہے کہ ان کے سفر قسطنطنیہ کے زمانہ تک دمشق میں موجود تھا، بعد میں جامع مسجد میں آگ لگ گئی اور وہ نسخہ نذر آتش ہو گیا، مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصحف عثمانی ۸۰۳ ہجری ہی میں جامع اموی میں آگ لگ جانے کے موقع پر تلف ہو گیا، ۱۳۱۰ ہجری کی

آگ میں مصحف بصری جو کسی مسجد سے لا کر یہاں رکھ دیا گیا تھا، وہ جل گیا تھا۔ یہ مصحف بصری بھی مصحف عثمانی کہلاتا تھا، اس کے بارے میں ابن فضل اللہ العمری نے لکھا ہے کہ اس پر خون کے دھبے تھے،

مکۂ معظمہ کا نسخہ

مکۂ معظمہ کے مصحف عثمانی کا ایک نسخہ ابن جبیر کی روایت کے مطابق قبۂ زمزم کے قریب قبۃ الشراب (قرآن کریم اور حرم شریف کی کتابوں کا مخزن تھا، اس میں مصحف مذکور محفوظ تھا جس کی کتابت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تھی اور سنہ کتابت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ۱۸ سال بعد (سنہ ۲۹ھ) تھی۔ قحط و گرانی کے موقع پر اس کو باہر نکالتے اور بیت اللہ کی چوکھٹ اور مقام ابراہیم کے درمیان رکھ کر دعا کرتے۔ ابن جبیر نے اہل مکہ کے ایک اجتماع کا ذکر کیا ہے جو ۲۲ شوال ۵۷۹ھ میں نماز استسقاء کے لئے ہوا تھا، ابن جبیر کے پہلے بیان میں خلفائے اربعہ میں سے کسی کا بتایا تھا، لیکن دوسرے بیان میں اس کو مصحف عثمانی لکھا ہے؛

ابوالقاسم تجیبی نے بھی ۶۹۶ ہجری میں اس کی زیارت کی، ۷۳۵ھ میں ابن مرزوق نے اس مصحف عزیز کو دیکھا تھا، اور مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے (جو ابن جبیر کے بیان سے بالکل ملتا جلتا ہے، مگر اس نے بھی اس کو مصحف عثمانی نہیں لکھا، گو سال کتابت ۱۸ سال بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کاتب کا نام زید بن ثابتؓ لکھا ہے جو حضرت عثمانؓ کا عہد ہے، علامہ سمہودی (م ۹۱۱) کے بعد تک مکہ معظمہ میں اس نسخے کی موجودگی ثابت ہے۔

مسجد نبوی کا نسخہ

اندلسی سیاح ابن جبیر کی روایت کے بموجب ۵۸۰ ہجری میں مسجد نبوی میں حجرۂ مبارک اور مقام النبی کے درمیان مصحف عثمانی محفوظ تھا۔ یہ نسخہ ان مصاحف میں سے ایک تھا جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مدینہ سے باہر بھیجے گئے تھے، مشہور مورخ ابن النجار بغدادی (م ۶۴۶ھ) نے اس نسخہ

کا ذکر کیا ہے لیکن اس کو مصحف عثمانی نہیں قرار دیا ہے، خطیب ابن مرزوق نے ۷۳۵ھ میں اس کی زیارت کی تھی اور انھوں نے اس کو مصحف عثمانی قرار دیا ہے، ان کے ایک معاصر محمد بن احمد المطری (م ۷۴۱ھ) نے بھی اس کو مصحف عثمانی لکھا ہے اور دسویں صدی ہجری کے اوائل تک عام طور پر مشہور تھا کہ یہی نسخہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مصحف خاص ہے، اس کا ثبوت اسی قدر تھا کہ آیت فسیکفیکھم اللہ، پر خون کے نشانات تھے، علامہ سمہودی (م ۹۱۱) کو اس سے اختلاف تھا، اس لئے کہ اس خصوصیت کے دو قدیم نسخے مکہ معظمہ اور قاہرہ میں ان کی نظر سے گذر رہے تھے، وہ زیادہ سے زیادہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے ارسال کردہ نسخوں میں سے ہو سکتے ہیں، انکی رائے میں مصحف خاص سے مشابہت پیدا کرنے کی غرض سے ان نسخوں کے اندر آیت مذکورہ رنگ دی گئی ہوگی،

ان کے علاوہ بعض اور بیانات میں مصاحف کا تذکرہ ملتا ہے۔

۱۔ ۶۵۳ ہجری میں مدرسہ بشیریہ کی تکمیل پر خلیفہ مستعصم باللہ (م ۶۵۶ھ) کی طرف نادر و نایاب کتابوں کے ۳۶ صندوق مدرسے کے کتب خانے کو بھیجے گئے تھے، ان میں قرآن کے دو بیش قیمت نسخے تھے، ان میں سے ایک حضرت عثمانؓ کے دست مبارک کا نوشتہ تھا،

۲۔ رمضان ۶۶۱ھ میں الملک الظاہر نے فرماں روائے قبچاق کو جو ہدایا بھیجے تھے، ان میں بقول ابن واصل ایک قرآن مجید بخط حضرت عثمانؓ بھی تھا، (سخاوی)

۳۔ آٹھویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطہ (م ۷۷۹ھ) نے بصرہ کی مسجد امیر المومنین علی کا ذکر کیا ہے، اس کے خزانے میں حضرت عثمانؓ کا مصحف خاص تھا جس کا ایک ورق جس میں آیت فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم، تھی خون آلود تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وھم یصلون الجمعۃ فی مسجد امیر المومنین علی رضی اللہ	وہ لوگ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے، اس میں

عنه ... وفیه المصحف الکریم	وہ مصحف بھی تھا جس میں حضرت عثمانؓ شہادت
الذی کان عثمانؓ یقرأ فیه لما	کے وقت تلاوت کر رہے تھے اور آپ کے
قتل واثر تغییرة الدم فی الورقة	خون کے نشانات اس صفحہ پر تھے جس میں
التی فیه قوله تعالیٰ فسیکفیکهم	اللہ تعالیٰ کا یہ قول درج ہے، اللہ انکے
الله وهو السمیع العلیم" (رحلہ ۱: ۱۱۴)	لئے کافی ہے اور سننے جاننے والا ہے"

مصاحف عثمانی کے بارے میں تاریخوں میں مندرج اطلاعات کا خلاصہ اوپر پیش ہوا، موجودہ دور کے محققین نے ان کی تلاش میں بڑی کاوش کی، استاد طاہر الکردی کو حجاز اور مصر کے کتب خانوں میں کوئی نسخہ نہیں مل سکا، ان کا خیال ہے کہ ۱۳۳۴ھ میں جب ترک حرمین سے بے دخل ہوئے تو مصحف مدینہ استنبول منتقل ہو گیا، کہتے ہیں جب استنبول اتحادیوں کے نرغے میں آگیا تو طلعت پاشا اس کو برلن لے گئے، اور کسی طرح وہ قیصر ولیم کے پاس پہنچ گیا، جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی صلح نامہ ورسائیس مرتب ہوا، اس صلح نامہ کی ایک دفعہ میں صاف اور واضح الفاظ میں اس مصحف کا ذکر ہے۔ "اس موجودہ صلح نامہ کے عمل میں آنے کے چھ مہینے کے اندر جرمنی جلالۃ الملک شاہ حجاز کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اصلی مصحف کو واپس کر دے گا، یہ نسخہ مدینہ میں ترکوں سے حاصل کیا گیا تھا اور سابق شہنشاہ ولیم دوم کو نذر کیا گیا تھا"۔ (حصہ سوم سکشن ۲ آرٹیکل ۲۴۶، صلح نامہ ورسائیس)

علامہ کردعلی جامع ایاصوفیا استنبول کے ایک مصحف کی بابت اپنے دوست شیخ مسعود الکواکبی کا بیان نقل کیا ہے کہ اس کے سرورق پر "حررہ عثمان بن عفان" کے الفاظ مکتوب تھے اور اس کی زیارت کا موقع ان کو کئی بار مل چکا ہے، خطیب الہمزہ دق نے ۳۵۰ ہجری میں مسجد نبوی میں اس نسخے کو دیکھا تھا اور اس پر عہد عثمانی کے کاتبین کے نام ان الفاظ میں تھے،

---

[۱] یہ اطلاع ڈاکٹر عابد علی عابد کی یادداشت، مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۵ میں مجمل درج ہے۔

هذا ما اجمع علیه جماعة من اصحاب	یہ وہ نسخہ ہے جس پر مندرجہ ذیل اصحاب
رسول الله منهم زید بن ثابت و	رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتفاق ہے زید بن
عبد الله بن الزبیر وسعید بن العاصی	ثابت، عبد اللہ بن زبیر اور سعید بن عاص

اس کے علاوہ اس پر یہ تحریر بھی ثبت تھی،

"قال النخعی لعله الکوفی او البصری"	امام نخعی کا بیان ہے کہ غالباً یہ کوفی یا بصری ہے"

بظاہر یہ تحریریں بعد کی معلوم ہوتی ہیں

ایک مصری فاضل شیخ عبد العظیم زرقانی نے لکھا ہے کہ مصر میں قرآن مجید کے کئی قدیم نسخے موجود ہیں، جو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب ہیں لیکن یہ انتساب صحیح نہیں اس لئے کہ یہ نسخے نقش و نگار اور زرکشی کے کام سے آراستہ ہیں، جو عہد عثمانی کے نسخوں کی خصوصیت نہ تھی، البتہ مسجد حسینی کا نسخہ عہد عثمانی کے نسخے کی نقل ہو سکتا ہے، دکتور صبحی الصالح[۱] نے نقش و نگار ہی کی بنا پر دار الکتب کے نسخوں کو عہد عثمانی کا ماننے سے انکار کیا ہے لیکن دار الکتب کا نسخہ زیر شمارہ ۱۳۹ ہر طرح کے نقش و نگار سے پاک ہے، بقول مرتب فہرست صدر اول کی خصوصیات کا حامل ہے، اس بنا پر بخوبی ممکن ہے کہ وہی نسخہ ہو جس کا ذکر مقریزی نے "خطط[۲]" میں کیا ہے، اگرچہ مقریزی نے نسخہ کی کوئی خصوصیت نہیں درج کی ہے لیکن عراقی تاجر نے اس کو نسخہ خاص کہا ہے اور اس پر خون کے دھبے بتائے ہیں، مرتب فہرست نے کچھ نہیں لکھا کہ اس پر خون کے نشانات ہیں یا نہیں، اگر نشانات نہیں تو یہ مقریزی کا نہیں ہو سکتا، نیز مقریزی کی یادداشت سے نسخہ مذکورہ آراستہ تھا، گر یہ نسخہ مذکور میں یادداشت شامل ہو تو وہی نسخہ ہوگا، ورنہ نہیں معلوم نہیں مرتب فہرست نے اس اہم معاملہ کو تشنہ کیوں چھوڑ دیا۔

تاشقند کے میوزیم میں مصحف عثمانی اس وقت تک موجود ہے جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے

---

[۱] مباحث فی علوم القرآن ص ۸۷، [۲] خطط ۲: ۱۱، ۱۹

بیان سے ظاہر ہے، علی سردار جعفری کی شہادت ہے کہ انھوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۶۱ کو اس نسخے کی زیارت کی تھی، یہ نسخہ ۵۳×۶۸ سینٹی میٹر کے ۳۵۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، نہایت نفیس اور جلی قلم سے خط کوفی میں ہے، خون کے دھبے اب تک موجود ہیں، صفحات کا رنگ ایک طرف ہلکا زرد ہے دوسری طرف سے سفید ہے، تحریر کے لئے ہرن کی کھال استعمال ہوئی، میوزیم کی ڈاکٹر نفیسہ صادق کا بیان ہے کہ خون کے دھبوں کے کیمیکل امتحان سے اس کی قدامت کا اندازہ لگایا گیا ہے، رسالہ سوویت دیس ۶ : ۲ بابت جنوری ۱۹۵۹ میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصحف عثمانی تیمور کے کتاب خانے میں تھا جو ۱۳۹۳ء میں دار الامارۃ سمرقند میں قائم کیا گیا تھا، پھر سمرقند کی مسجد خواجہ احرار میں آگیا اور صدیوں تک اس مسجد میں ایک مرمریں ستون سے زنجیروں سے معلق رہا، ۱۸۶۸ یا ۱۸۶۳ میں زار روس ترکستان پر قابض ہوا تو روسی گورنر دان کاف مان کی نظر میں یہ نسخہ آیا، اس نے سو روبل میں اسے خرید کر سینٹ پٹرس برگ کے شاہی کتاب خانے میں بھیج دیا گیا، ۱۹۱۷ میں روسی انقلاب کے بعد انقلابی دستے کے مسلمان سپاہیوں نے اس کو اپنے قبضے میں لینا چاہا لیکن کسی وجہ سے ان کو نہ مل سکا، بالآخر پیتر دگراد صوبائی مسلم کانگریس نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا) اور مجلس وزراء کے حکمنامہ مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۱۷ کے مطابق یہ مصحف عظیم روسی پارلیمان کے مسلم نمائندوں کے جلسے میں او فا پہنچا، پھر اسے ازبکستانی جمہوریہ کے پایۂ تخت تاشقند پہنچا دیا گیا، جہاں اب تاریخی میوزیم میں محفوظ ہے، رسالہ سوویت دیس میں خون کے نشان بتائے گئے ہیں اور اس بات کی صراحت ہے کہ روسی مستشرقین نے اس کی قدامت تسلیم کرلی ہے، میوزیم کی ڈاکٹر کے بیان سے بھی روسی نشریہ کے مندرجات کی تائید ہوتی ہے، انھوں نے مزید یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ تیمور اس نسخہ کو قسطنطنیہ سے لایا تھا،

اس نسخہ شریفہ سے سورہ ،، یٰسین ،، کا ایک عکس ۱۹۰۵ء میں ایک روسی عالم عبد اللہ الیاس بورغانی القرملی نے شائع کیا تھا، بورغانی کو اصل نسخہ ۱۸۸۹ء میں پیٹرس برگ کے شاہی کتاب خانے میں دیکھنے

کا شرف حاصل ہوا تھا، یہ خط کوفی میں چمڑے پر لکھا ہوا ہے، اور اس کے صفحات کو کنارے کی طرف ٹیڑھا کرکے دیکھا جائے، تو حروف شیشے کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، کل ۶۰ صفحات ہیں، اور آیت شریفہ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ پر خون کے دھبے موجود ہیں، سورۂ یٰسین ۲۲ صفحات کو حاوی ہے، اس کے ایک صفحہ کا عکس قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی کتاب مآثر و معارف (ص ۲۲) میں شائع کیا ہے، قاضی صاحب کا مضمون اس عنوان سے شائع ہوا ،مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکڑا، (سورۂ یٰسین)

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے، کہ مسجد نبوی کے نسخے کے بارہ میں خون کے دھبے کا ذکر دسویں صدی تک کے مورخین کی تحریروں میں ملتا ہے، اور اسی بنا پر عام طور پر یہ نسخہ حضرت عثمانؓ کا نسخہ، خاص سمجھا جاتا تھا، گو علامہ سمہودی (م : ۹۱۱) کو اس سلسلے میں برابر شک رہا، بہر حال اگر استنبول والا نسخہ وہی ہے جو مسجد نبویؐ سے منتقل ہوا ہے، تو اس پر خون کے دھبے ہونا چاہیئے، اس لئے کہ مورخین نے ذکر کیا ہے کہ آیت فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ پر دھبے موجود ہیں، اگر یہ حقیقت ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ روسی نسخہ اس کی اصل ہے، یا ترکی،

(باقی)

علمی خطوط

(۱)

دفتر: اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۲۰ مئی ۱۹۸۰ء

مخدوم و محترم السلام علیکم

پرسوں پروفیسر محمد اسلم صاحب کے یہاں فروری کا معارف دیکھا۔ آپ کے بدیع الاسلوب قلم نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی خدمات کا تذکرہ جن خوبصورت الفاظ میں لکھا ہے وہ انشائے عالیہ میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ پروفیسر عبدالقیوم صاحب نے بھی آپ کے شذرات کو بہت پسند کیا ہے۔

کتاب الشفاء پر جناب ضیاء الدین اصلاحی کا مضمون بھی بہت خوب ہے، کتاب الشفا کی شرح میں ملا علی قاری کی شرح بھی قابل ذکر ہے جو آج سے تقریباً نوے برس پیشتر آستانہ (قسطنطنیہ) سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ کتاب الشفاء کی تعریف و توصیف میں خطبات مدراس (مولانا سید سلیمان ندوی) کے بعض دلآویز فقرے بھی قابل توجہ ہیں،

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان (عربی ادب) پر فاضل تبصرہ نگار کا تبصرہ تقریباً صحیح ہے، انہوں نے جن کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے، وہ متعلقہ ادارے کے لئے محتاج توجہ ہیں خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ نظرثانی اور پروف ریڈنگ کا کام ان اصحاب نے کیا ہے جو عربی زبان اور علوم اسلامیہ سے نابلد تھے، اشاریہ (انڈکس) کا بھی یہی حال ہے، دوسری خرابی کی وجہ کتابوں

کی عدم دستیابی ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں بھارت اور پاکستان کے درمیان سالہا سال تک خطوط اور اس کے بعد رسائل و کتب کی ترسیل بند رہی ہے، ہمارے یہاں کے اکثر شائقین علم اسلامی ہند کی مطبوعات سے بے خبر رہتے ہیں، اس کے علاوہ بھارت سے جو اصحاب علم و فضل آتے ہیں، وہ سیدھے کراچی کا رخ کرتے ہیں، لاہور میں ان کا قیام نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان سے استفادہ یا تبادلۂ خیالات نہیں ہو سکتا، تاریخ ادبیات (عربی) ۱۹۷۲ء میں مرتب ہوئی تھی، علی میاں کی "السیرۃ النبویۃ" (سال اشاعت ۱۹۷۸ء) اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی ایڈٹ کردہ ان کتابوں کا ذکر اس میں کیسے ہو سکتا تھا جو کتاب کی ترتیب اور اشاعت کے بعد گذشتہ پانچ چھ برسوں میں شائع ہوئی ہیں، بہرحال یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مولانا اعظمی کی علمی کاوش سے مجمع بحار الانوار شائع ہو چکی ہے۔ نول کشوری نسخہ تو بدخط اور غلط سلط ہے۔ فاضل تبصرہ نگار تاریخ ادبیات اور لٹریری ڈائرکٹری میں بھی فرق محسوس نہیں کر سکے، تاریخ ادبیات میں صرف چیدہ چیدہ معیاری کتابوں کا ذکر ہوتا ہے نہ کہ کتابچوں، رسالوں اور مضامین کا، ایک اور بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ تقریباً چوالیس برس سے دارالمصنفین میں مقیم ہیں اور آپ کے اسلامی ہند کے بیشتر اکابر سے مخلصانہ اور نیازمندانہ تعلقات رہے ہیں، جن کے دیکھنے والے اب اٹھتے جا رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے سوانح مرتب کریں اور ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم کی "یادوں کی دنیا" کی طرح ان اکابر کے حالات اپنے سوانح کے آخر میں شامل کر دیں تاکہ نئی نسل ان سے روشنی اور ہدایت حاصل کر سکے، بزم صوفیہ بھی تکمیل کی منتظر ہے۔

سیرت شامی قاہرہ میں چھپ رہی ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور دوسرے رفقاء کی خدمت میں سلام عرض کر دیں، بہت سے اصحاب تذکرۃ المحدثین جلد سوم کا انتظار کر رہے ہیں۔ فقط والسلام مع الاکرام

نیازمند، (شیخ) نذیر حسین، مدیر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

(۲)

شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

۱۰ مئی ۱۹۸۲ء برادر محترم السلام علیکم

آپ مجھے بتائے بغیر دو بار پاکستان گئے، میں بھی دعا کرتا رہا کہ کبھی مجھے آپ سے انتقام لینے کا موقع ملے، آخر اللہ تعالیٰ نے مری سن لی اور مجھے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے دس دن کے سفر کا دعوت نامہ موصول ہوگیا، میں بھی آپ کو بتائے بغیر ہی گیا اور اب واپس آگیا ہوں۔

اب آئندہ سفر پاکستان کا کب ہوگا؟ دونوں اکٹھے چلیں تو لطف آجائے،

کبھی ملاقات ہو تو آپ کو بتاؤں کہ انسان اور انسان میں کس قدر پیار کا رشتہ موجود ہے، میرا یہ سفر آنسوؤں کی وادی کا سفر تھا۔ پاکستان کے اہل علم نے ایک بے علم شخص کی کس قدر پذیرائی کی، کاش یہ بتانے کے لئے میرے پاس الفاظ ہوتے، پاکستان نے اقبال پر میرے چھوٹے موٹے کام کی جو قدر کی ہے، وہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ ہیچ مداں اور کج مج بیان پر اللہ کا خاص کرم ہے ورنہ میں کیا اور اقبال پر میرا کام کیا۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور، کراچی یونیورسٹی کراچی، پشاور یونیورسٹی پشاور، اور علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد میں علامہ اقبال کے فکر و فن پر میرے چار لیکچر ہوئے۔

لاہور اور کراچی میں مجھے رائٹرز گلڈ کی طرف سے استقبالیے دئے گئے، پشاور میں ایاسین آرٹس کونسل نے اور اسلام آباد میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے بھی استقبالیے سے نوازا گیا۔

اس سفر میں اپنے گاؤں عیسیٰ خیل بھی گیا اور میانوالی بھی دونوں جگہوں پر متعدد جلسے

منعقد کئے گئے، عیسیٰ خیل میں پاکستان کے مشہور ماہر موسیقی عطاء اللہ خاں نیازی نے ایک محفل موسیقی بجائی اور اپنے نغموں میں میرے والد جناب تلوک چند محروم صاحب کا ذکر کرکے مجھ کو اس انداز سے خطاب کیا کہ ساری محفل آبدیدہ ہوگئی۔

میانوالی سے جب میری گاڑی چلی تو دریائے سندھ کے پار عیسیٰ خیل تک ایک پائلٹ جیپ میری گاڑی کے آگے آگے چلتی رہی۔ میانوالی سے دس بارہ گاڑیوں میں میرے احباب اور معززین شہر میرے ساتھ عیسیٰ خیل تک گئے، عیسیٰ خیل کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا، سڑکوں پر رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگائی گئی تھیں، میرے والد کے اور میرے اشعار سے شہر کے در و دیوار مزین تھے، عیسیٰ خیل اور میانوالی دونوں جگہوں پر متعدد استقبالیے دئے گئے، جن میں میرے والد صاحب کو خصوصاً خراج تحسین ادا کیا گیا۔

اسلام آباد میں صدر پاکستان جناب محمد ضیاء الحق سے بھی ملاقات ہوئی اور بات چیت میں ان کے سامنے میں نے یہ تجویز رکھی کہ اب جب کہ پاکستان میں بھی ایک اکیڈمی آف لیٹرز قائم ہوگئی ہے تو ہندوستان اور پاکستان میں ان اکاڈمیوں کے ذریعے سے ادیبوں، شاعروں اور اصحاب علم و ادب کا تبادلہ ہونا ضروری ہے، تاکہ ادیبوں اور اہل قلم کو ایک دوسرے کے ممالک کے بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کا پتہ چل سکے، جناب صدر صاحب نے پوری توجہ کے ساتھ مری یہ بات سنی،

خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں

والسلام

جگن ناتھ آزاد

بابُ التقریظ والانتقاد

"زندہ رود"

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مذکورۂ بالا کتاب کے گرد پوش پر ایک رنگین تصویر میں علامہ محمد اقبال ایک بچہ کو گود میں لئے ہوئے انتہائی مسرور نظر آرہے ہیں، یہ وہ بچہ ہے جس کے نام پر انھوں نے اپنی ایک مشہور مثنوی کا نام رکھا، اور آگے چل کر اس کو مخاطب کر کے کہا:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی ۔۔۔ خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

اور یہ بھی:

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ۔۔۔ ہے اُس کا مذاق عارفانہ

یہ بچہ ــــــ **ڈاکٹر جاوید اقبال** ــــــ اب جوان ہو کر لاہور ہائی کورٹ کا جج ہے، اپنے والد بزرگوار کے کلام کا صحیح ترجمان بھی بن گیا ہے، اور چند مہینے پیشتر اردو زبان وادب کے افق پر ان کے سوانح نگار کی حیثیت سے نمودار ہوا ہے۔

علامہ محمد اقبال کی **جاوید نامہ** میں جو مختلف کردار ہیں، اُن میں ایک **زندہ رود** بھی ہے، جو خود علامہ ہیں، ان کے اس سوانح حیات کا یہ نام رکھ کر ان کے لائق فرزند نے ان ہی کی طرح اپنی جدت ذہن کا ثبوت دیا ہے، زندہ رود کے معنی مسلسل بہتی ہوئی حیات آفریں ندی بتائے گئے ہیں، جس کی

خصوصیت یہ ہے کہ یہ اچکتی، اٹکتی، بچکتی، سرکتی، اچھلتی، پھسلتی اور بڑے پیچ کھا کر پہاڑوں کو چیرتی ہوئی بہتی ہے، "زندہ رود" پڑھ کر یہ اثر قائم ہوا کہ اس کی تحریر اچکتی، اٹکتی، مچلتی، اچھلتی، سنبھلتی اور بڑے پیچ کھا کر تاریخی، سیاسی، اور معاشرتی واقعات کے تودوں کو چیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

ان کے والد بزرگوار کی سوانح عمریاں اب تک جتنی لکھی گئی ہیں، اُن سے وہ مطمئن نہ تھے، اس لئے وہ ان کی ایسی سوانح عمری لکھنا چاہتے تھے جس میں ان کے خیالات وافکار کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ ان کے ماحول کا بھی جائزہ ہو، اس جائزہ میں یہ کتاب مصنف کے والد بزرگوار اور اُن کے اجداد کے دور کی ایک روحانی، سیاسی، عمرانی اور ادبی تاریخ بھی بن گئی ہے، جس کو پڑھنے میں اجمال اور تفصیل دونوں کا مزہ ملتا ہے، لائق مصنف جج کے عہدے پر اس وقت فائز ہیں، اس لئے جو کچھ لکھتے ہیں اس میں جج کی جرح بھی ہے اور واقعات کی چھان بین بھی، اس کا اصلی وصف اس کا ایجاز ہے، اس میں کہیں اکتا دینے والی تفصیل نہیں، اور نہ کہیں ایسا اختصار ہے جس سے یہ خیال ہو کہ مصنف کو اور لکھنا چاہئے تھا جو نہ لکھ سکے، اس میں تمام باتوں کی اتنی ہی تفصیل ہے جتنی کہ خوش مذاق قارئین کو پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے مطالعہ سے قارئین کو غیر شعوری طور پر محسوس ہوگا کہ اس میں وہ بھی ہے جو ان کو معلوم نہ تھا، اور وہ سب کچھ ہے جو ان کو معلوم تھا، لیکن ان سب کو کچھ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھتے وقت یہ بھی محسوس ہوگا کہ ان کو جو کچھ پہلے سے معلوم تھا اُن میں از سرِ نو تازگی بلکہ جلا پیدا کرنے کی ضرورت تھی جو اس کتاب سے پوری ہوگئی۔

اس میں تاریخ، سیاست، شعر و ادب اور تصوف کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے مطالعہ میں کچھ روحانیت کی سی لذت پیدا ہونے لگتی ہے، اس کے مصنف اپنے اشہب قلم کو اپنی چابکدستی سے جب اور جس طرح چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں، وہ اپنے والد بزرگوار اور ان کے اجداد کے حالات

لکھتے لکھتے یکایک اس زمانہ کے سیاسی اور تاریخی واقعات کی عکاسی کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور جب ان کے قارئین اس ماحول کی مرقع آرائی سے محظوظ ہونے لگتے ہیں تو پھر اچانک اپنے خاندان کے بزرگوں کو ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں، انھوں نے جو تاریخی اور سیاسی واقعات لکھے ہیں وہ کچھ پردۂ اخفا میں نہ تھے، بلکہ جانے بوجھے ہوئے ہیں، مگر موضوع کے پس منظر کو نمایاں کرنے کی خاطر وہ بڑی خوش سلیقگی سے سجائے گئے ہیں، جس کی بڑی کمی علامہ اقبال کے پہلے سوانح نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب اور ۱۵۷ صفحات پر مشتمل ہے، پہلا باب "سلسلۂ اجداد" کے عنوان سے ہے، اس سے معلوم ہو گا کہ علامہ اقبال کے اجداد کشمیری برہمنوں کی گوت سپرو سے تھے، سپرو کی اصلیت سے متعلق کئی روایتوں کے حوالے دئے گئے ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ اس کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاپور سے ہے، ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ یہ مصری النسل ہیں مگر ڈاکٹر جاوید اقبال ان روایتوں سے اتفاق نہیں کرتے، انھوں نے اپنے والد ماجد ہی کے ایک خط سے تصریح کی ہے کہ کشمیر میں جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور مسلمانوں کی حکومت کا اعتماد حاصل کیا وہ ہندوؤں میں از راہ تعریض و طنز سپرو کہلائے، اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے، اسی سپرو گوت سے علامہ اقبال کے جد اعلیٰ بابا لول حج تھے جو ان کی پیدائش سے ساڑھے چار سو سال پہلے پندرہویں صدی میں سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کے زمانہ میں (۱۴۲۰ - ۱۴۷۰ء) مسلمان ہوئے، اس سلطان کے کشمیری خاندان کے اور سلاطین کا ذکر بھی مختصر طریقہ پر آگیا ہے، ان ہی میں سے سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں مسلمان رشیوں نے تبلیغ اسلام شروع کی، ان کا ذکر احترام سے کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ان ہی میں شیخ نصر الدین بابا لول حج کے مرشد تھے، جو نسلاً ذات کے کھشتری راجپوت تھے، ان کشمیری رشیوں کی تفصیل لکھنے میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس برصغیر میں صوفیہ کے جو معروف سلسلے یا طریقے رائج ہوئے ان کے

بانی عموماً سید تھے، جو وسطی ایشیا یا مشرق وسطیٰ سے یہاں آئے اور یہیں وفات پاگئے، ان کے خلفا یا جانشین بھی اکثر ان ہی کے خاندان میں سے ہوئے، لیکن سلسلۂ ریشیاں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بانی کشمیر کے ایک کھشتری راجپوت نو مسلم کے فرزند تھے، ان کے خلفا اور مریدین بھی سب کے سب نو مسلم تھے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات ویدانتی اور وجودی فکر کے امتزاج پر مبنی تھیں (ص ۹)

ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کے مطابق بابا لول حج کی آنکھیں بھینگی تھیں اور پاؤں ٹیڑھے تھے، شادی کے بعد ان کی بیوی ان پر ہنسا کرتی تھیں، اس لئے وہ دل برداشتہ ہو کر تارک الدنیا ہو گئے، پہلے حرمین شریفین کا رخ کیا، پھر بارہ سال تک سیاحت کرتے رہے، کشمیر واپس ہوئے تو بابا نصر الدین کے مرید ہو کر سلسلۂ ریشیاں سے وابستہ ہو گئے، اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال رقمطراز ہیں کہ بیوی کا رویہ باطنی حسن کی تلاش اور جستجو کے لئے مہمیز ثابت ہوا (ص ۵) بابا لول حج کی اولاد میں ایک بزرگ شیخ اکبر تھے، جو علامہ اقبال کے دادا یا پڑدادا تھے، ان کے مرشد ایک سید تھے جن کے انتقال کے بعد انھوں نے ان کے مریدوں کو سنبھالا، گویا ان کے خلیفہ ہوئے (ص ۹) علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد قادریہ سلسلہ کے بزرگ سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود دربار آوان شریف کے مرید تھے، بچپن میں علامہ بھی اسی سلسلہ میں بیعت ہو گئے تھے (ص ۶۴) اسی مناسبت سے ان کو اپنے گھر کے عارفانہ ذوق پر فخر تھا، خود ڈاکٹر جاوید اقبال بھی رقمطراز ہیں کہ ان کے والد بزرگوار کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جو فطری طور پر دنیوی یا مادی آسودگی سے کہیں زیادہ اخلاقی اور روحانی مسرتوں کی جستجو میں تھا، اور جو دنیا کے مقابلہ میں ہمیشہ دین کو ترجیح دیتا تھا (ص ۱۵)

یہ خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آیا، ہجرت کے اسباب کے سلسلہ میں کشمیر میں افغانوں کے زوال اور سکھوں کے تسلط کی تاریخ اجمالی طور سے موثر انداز میں پیش کی گئی ہے، یہاں سکھوں کی حکومت ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء یعنی ستائیس برس تک رہی، لیکن اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے جو

خوں ریزی اور سفاکی کی، اس کی داستان بہت ہی دردناک انداز میں لکھی گئی ہے، کوئی مسلمان گائے ذبح کرتا تو سری نگر کی گلیوں میں اس کو گھسیٹا جاتا اور پھر اس کو پھانسی دے دی جاتی، ٹیکسوں کا اتنا بوجھ تھا کہ قصبے فقیروں سے اٹے پڑے رہتے، اس زندگی سے عاجز آکر وہاں کے لوگ ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے لگے، ان ہی حالات میں علامہ کا خاندان پنجاب آگیا (ص ۱۵) اور سیالکوٹ میں آباد ہوا، جہاں شیخ نور محمد پیدا ہوئے، اس پہلے باب کا خاتمہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے یہ لکھ کر ختم کیا ہے:

"ان کے (یعنی ان کے والد بزرگوار کے) اشعار میں برہمن نسبت کی طرف اشارے ہیں، مگر ان میں طنز کا پہلو نمایاں ہے، یعنی یہ کہ سیاست کے میدان میں مسلمان ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں، لیکن قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ اگر یہاں کوئی حقیقی معنوں میں اسلام کے اسرار و رموز یا اس کے روشن مستقبل سے آگاہ ہے تو برہمن زادہ تھا۔"

اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ

"ان کے بعض اشعار سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فلسفہ ایسے علوم پر ان کے عبور کا سبب ان کا برہمن نسب ہونا تھا، مگر انھوں نے خود ہی فلسفہ کو دینی رہبری کے لئے ناکافی پاکر مسترد کر دیا، ان کے تجربے میں تو عشق رسول ایسی نعمت ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے تمام فکری مسائل کو حل کر سکتے تھے، اس لئے قرآنی تعلیمات سے ان کا شغف اسلام کے ساتھ ان کی محبت اور مسلمان ہونے پر ان کا فخر وہ فطری عناصر تھے جن سے ان کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔ (ص ۱۶)

یہ ایسا جامع اور پُر مغز تبصرہ ہے جس سے اس شاعر اسلام کے افکار کو صحیح طور پر سمجھنے میں پوری مدد ملے گی، اور یہ ان کی ذات اور ان کے کلام کا ایک عارف ہی لکھ سکتا تھا، خوشی ہے کہ یہ معرفت خود جلیل القدر باپ کے قدر شناس فرزند کو حاصل ہوئی۔

کتاب کا دوسرا باب "خاندان سیالکوٹ میں" کے عنوان سے ہے، پہلے اس میں سیالکوٹ کی مختصر لیکن دردناک تاریخ ہے، پھر پورے ہندوستان کے اُن ناساعد اور ناموافق حالات پر مورخانہ تبصرہ ہے جن میں مسلمان صبر آزما مصائب میں مبتلا تھے، سلاطین دہلی کے عہد میں سیالکوٹ کے مسلمان امن سے زندگی بسر کرتے رہے لیکن چودہویں صدی میں جب دہلی کی سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی تو سیالکوٹ کا باج گذار حکمراں سنہ پال اس پر قابض ہوگیا، اس نے یہاں کے قلعہ کو ہمیشہ کے لئے دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے جوتشیوں کے مشورہ سے ایک مسلمان کو بے دردی سے ذبح کر کے اس کے خون کو بنیاد میں استعمال کیا، سید امام علی الحق نے سلطان فیروز شاہ کے لشکر کی مدد سے اس کے خلاف لڑ کر سنہ وراج کو ختم کیا، گو معرکہ میں خود شہید ہوئے، مغلوں کے عہد میں یہ قصبہ پھلتا پھولتا رہا، صوفیہ اور مشایخ کے حسن عمل اور خلق محمدی سے متاثر ہو کر یہاں کے ہندو اسلام قبول کرنے لگے، مگر ۱۸۰۷ء میں اس پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہوگیا، تو یہاں کے مسلمان مصائب میں مبتلا ہوگئے، جس سے متاثر ہو کر حضرت سید احمد شہید بریلویؒ نے (۱۷۸۶ء-۱۸۳۱ء) دہلی، اتر پردیش، بنگال اور دکن کے سرفروشوں کی ایک جانباز جماعت تیار کی، اور سکھوں کے مظالم کے خلاف جہاد کیا، وہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۰ء تک سکھوں سے جنگ کرتے رہے مگر جب چند افغان سرداروں نے سکھوں سے مل کر ان کے خلاف سازش کی تو وہ ۱۸۳۱ء میں شاہ محمد اسماعیلؒ کے ساتھ بالاکوٹ میں شہید ہوگئے، لیکن ان کے حامیوں نے سکھوں کے خلاف جہاد جاری رکھا، یہ مجاہدین ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کے خلاف بھی برابر لڑتے رہے، مگر جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو انھوں نے سکھ نوجوں کے ساتھ مسلمانوں پر بڑے ہولناک مظالم کیے، جامع مسجد سکھوں کی بارک بن گئی، زینت المساجد کو گوروں نے اپنا مسکن بنا لیا، ستائیس ہزار مسلمانوں کو پھانسی دی گئی، سات دن تک ان کا قتل عام جاری رہا، پھر عیسائی مشنریوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رکیک حملے شروع کئے، سیالکوٹ کے اندر بھی مسلمانوں پر انگریزوں کے ظلم و ستم ہوتے رہے،

۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کے کچھ لوگ بھی سولی پر چڑھے، ان کو توپ سے بھی اڑایا گیا اور ان پر پچاس ہزار روپے کا اجتماعی جرمانہ بھی ہوا، ان ہی حالات میں علامہ محمد اقبال کا خاندان سیالکوٹ میں زندگی بسر کر رہا تھا، اس نے اپنی آنکھوں سے انگریزوں کے ظلم و استبداد کو دیکھا تو ان کے خلاف نفرت پیدا ہوئی، (ص ۲۷) اسی حوصلہ شکن ماحول کے ساتھ ماضی گذر رہا تھا، لیکن مستقبل کو ہنوز پیدا ہونا تھا، کہ علامہ محمد اقبال ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

اس ماحول کا ذکر اس کتاب میں اس لئے کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے خاندان والوں کی زبانی اس کی کہانی سنی ہوگی، آگے چل کر خود اس کی تفصیل پڑھی ہوگی، وہ ایک جلیل القدر شاعر ہونے کو تھے، اس لئے ان کا اس ماحول سے متاثر ہونا ناگزیر تھا، مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت ان سے چھن گئی، ان کی تہذیب کی غارت گری ہوئی، ان کے مذہب اور ان کے رسول پر حملے ہوئے، اور ان کے وجود کو ختم کرنے کی پوری کوشش رہی، اس کے بعد ایک شاعر اسلام کے پیدا ہونے کی ضرورت تھی جو علامہ محمد اقبال کی ذات گرامی سے پوری ہوئی، ان کے والد بزرگوار نے ان کی اس نشوونما میں اس لحاظ سے مدد کی کہ ان کو اپنے اس فرزند ارجمند کے ایمان کی سلامتی کی برابر فکر رہی، ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ربع آخر کے مسلم بزرگوں کا یہ مستقبل پر بہت بڑا احسان تھا کہ ان کی توجہ سے آنے والی نسل میں اسلامی عصبیت بیدار رہی (ص ۲۸)

تیسرے باب میں علامہ اقبال کے سنہ ولادت کی تعیین بڑی محنت سے کی گئی ہے، جتنے مختلف سنہ اب تک لکھے گئے تھے ان پر جرح ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک فاضل جج ہی کی طرح کی ہے، اور اپنا فیصلہ صادر کیا ہے کہ ان کی پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء میں ہوئی، حیرت ہے کہ اس فخر روزگار کی پیدائش کی صحیح تاریخ کہیں درج نہیں جس کی تعیین میں اس کتاب کے بیس صفحے صرف کرنے پڑے۔

چوتھا باب "بچپن اور لڑکپن" کے عنوان سے ہے، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ

علامہ اقبال بچپن میں اپنے والد بزرگوار کی صحبت اور اپنے استاد سید میر حسن کی تعلیم و تربیت سے متاثر ہوئے، اس باب میں موثر انداز میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ نور محمد بہت دین دار تھے، وہ روزی کمانے کے دھندے سے فراغت پاتے تو اپنا وقت علماء و فضلاء کی صحبت میں گذارتے، ان کو تصوف سے بے حد شغف تھا، محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کا درس ان کے گھر پر ہوتا، علامہ اقبال اس درس میں برابر شرکت کرتے اور اپنے والد بزرگوار کی صحبت سے بھی فیض اٹھاتے، چنانچہ ان کو کہنا پڑا کہ میرا کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہ شفقت ایک طرف (ص ۵۳)

شیخ نور محمد نے اپنے بیٹے کو دینی تعلیم بھی دلائی پھر اپنے ساتھ قادریہ سلسلہ میں بیعت بھی کرائی اور یہ ہدایت دی کہ "جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے، یعنی اللہ خود تم سے ہم کلام ہے (ص ۶۵) اور ان سے اپنی تربیت کی محنت کا معاوضہ اس صورت میں مانگا کہ وہ اسلام کی خدمت کرتے رہیں (ص ۶۵) علامہ اقبال کو یہ اعتراف رہا کہ جو چیز یورپ کی درسگاہوں میں نہیں ملی، وہ ان کو اپنے والد کی صحبت میں ملی (ص ۵۳) انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ میں نے اپنا زاویۂ حیات فلسفیانہ جستجو سے حاصل نہیں کیا، زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ورثہ میں مل گیا تھا، بعد میں عقل اور استدلال کو اسی کے ثبوت میں صرف کیا (ص ۶۴) خود ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس سلسلہ میں یہ لکھا ہے کہ

"اقبال کے گھر کا ماحول دیندارانہ اور درویشانہ تھا جس میں محبت و شفقت کے ساتھ عزت و احترام کو بڑا دخل تھا، اقبال گو لطائف وجدانی کو تسلیم کرتے تھے، ان کے ورود کا ذاتی تجربہ بھی کچھ حد تک رکھتے تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں تصوف کے بارے میں علمی اعتبار سے ان کے ذہن میں کچھ الجھنیں پیدا ہوئیں اور ان کا زاویۂ نگاہ بدل گیا" (ص ۶۸)

یہ رائے بڑی اہم ہے، علامہ اقبال اور تصوف کا مسئلہ بڑا متنازعہ فیہ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان الجھنوں کی ابتلاء سے تصوف سے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ عارضی یا مستقل طور پر

بدلا ہا اور ان کی یہ الجھنیں عجمی تصوف یا اسلامی تصوف سے پیدا ہوئیں؟۔

بچپن ہی میں نہیں بلکہ آگے چل کر بھی ان کے استاد سید میر حسن ان کے ذہن پر حاوی رہے جو سر سید کی تحریکات سے متاثر تھے، اس لئے اس باب میں سر سید کے تمام کارناموں کا بڑا اچھا جائزہ لیا گیا ہے جو اس کتاب کا ایک اہم حصہ ہے، اس سے یہ بھی دکھانا مقصود ہے کہ علامہ اقبال سر سید سے بھی متاثر رہے، ان کی ادبی تحریک سے شاعروں نے ملت کی فلاح و بہبود کی خاطر با مقصد شاعری کی بنیاد رکھی، جس کو ظاہر ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے شاعرانہ کارناموں سے منتہائے کمال تک پہونچا دیا، اس باب میں بعض قارئین کو یہ پڑھ کر شاید تعجب ہو کہ علامہ اقبال اپنے بچپن میں اکھاڑے میں بھی اترے، دنگل بھی لڑے اور کبوتر بھی اڑایا کرتے، اس کو پڑھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں کس بل آیا اور ان کے پر تخیل میں غیر معمولی قوت پرواز بھی پیدا ہوئی۔

پانچواں باب "گورنمنٹ کالج لاہور" کے عنوان سے ہے، اس میں علامہ اقبال کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی تفصیل ہے، اس زمانہ میں وہ اپنے استاد ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ کے بھی گرویدہ رہے، اس باب کا اہم حصہ وہ ہے جس میں علامہ کے اس دور کی شاعری کا بہت عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر جاوید اقبال کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں ان کے والد بزرگوار کی توجہ گرد و نواح کی طرف مبذول ہونے کے بجائے زیادہ تر اپنی ذات پر مرکوز تھی، فلسفہ کے مطالعہ سے ان کی غزلوں کے روایتی مضامین بعض اوقات حکمت کے موتی بکھیرتے نظر آتے ہیں، مگر اس زمانہ میں ان میں فکری الجھنیں بھی پیدا ہو گئی تھیں، جس کے اسباب یہ تھے کہ انھوں نے ہیگل، گوئٹے، میرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سب سے کچھ نہ کچھ استفادہ کیا، ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہونچنے میں ان کی رہنمائی کی، بیدل اور غالب نے بھی انھیں بہت کچھ سکھایا، ان کا خود بیان ہے کہ ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانہ میں انھیں دہریت سے بچا لیا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ وہ اپنے ذہنی تجسس کی

وجہ سے خالصتاً ذاتی اور باطنی نوعیت کی کشمکش میں مبتلا تھے، کیونکہ وہ اس عہد میں کسی بات کی صحت و صداقت کو دوسروں کی سند کے حوالے سے تسلیم کرنا پسند نہ کرتے تھے، دہریت کی عارضی کیفیت غالباً ہیگل کے مطالعہ سے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے خود ہی یہ سوال پیدا کیا ہے کہ جب اقبال کی تعلیم و تربیت ابتدا ہی سے روایتی اسلامی نہج پر ہوئی تو ورڈز ورتھ نے انھیں کیوں اتنا متاثر کیا؟ اس کا جواب وہ خود ہی یہ دیتے ہیں کہ اقبال کا ذاتی تجسس اس امر کا شاہد ہے کہ وہ خود اپنی روایت کی تنگ اور محدود فضا سے بیزار تھے، یورپی فلسفہ کے مطالعہ سے انھیں ذہنی خلفشار پیدا ہوا جس میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا یورپی فلسفہ بھی مبتلا تھا۔ اس لئے اگر ان کے متجسس ذہن اور شاعرانہ قلب نے ورڈز ورتھ کے مطالعہ سے عقلیت کے کھوکھلے پن کا ایک ناقابل فہم جواب پالیا، تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، بلکہ یہ تو ان کی سلامتی عقل کی دلیل تھی کہ وہ اپنے عہد کے مادہ پرستانہ نظریات سے اثر قبول کرنے کے باوجود ان سے اپنے کو گمراہ نہ ہونے دیا، فلسفہ و تصوف کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ورڈز ورتھ کے خیالات ابن عربی کی وجودی تعلیمات سے کتنی مشابہت رکھتے ہیں، اس سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ذہنی ارتقاء کے اس مرحلہ میں اقبال کو تصور وحدت الوجود ہی نے عالم تشکیک سے نکالا (ص ۸۴)

ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ تجزیہ علامہ کے ان حامیوں کو ضرور متوجہ کرے گا جو یہ کسی طرح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ وہ وحدت الوجود سے بھی متاثر ہوئے، بلکہ وہ اس تصور کو ان سے منسوب کرنا ان پر ایک بڑا الزام سمجھتے ہیں، اس کے بعد ان کے اس دور کی شاعری کا مزید تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"اس مختصر دور کی شاعری میں اقبال کے ارتقائے فن کی رفتار بہت تیز تھی، بعض غزلوں میں فن کی پختگی کے ساتھ فکر کی گہرائی نمایاں ہے، غزلوں میں گو عشق مجازی کی آمیزش ہے، لیکن مضامین میں ہر قدم پر متصوفانہ یا حکیمانہ شاعری روایتی

تغزل کو پیچھے دھکیل رہی ہے، انداز بیان میں انوکھا پن بڑھ رہا ہے، وجودی فلسفہ کے زیر اثر بعض اشعار تصوف کے روایتی نظریۂ فنا کی ترجمانی کرتے ہیں، گویا اقبال کے نزدیک نفس کی انفرادیت ایک سعریب ہے، جو نمود حق کے بعد خود بخود مٹ جاتا ہے، اور پھر وہی ازلی حقیقت "خدا" رہ جاتی ہے، اس عہد میں اقبال نے وجودی فلسفہ کی روشنی میں اپنے سیاسی تصورات کی بنیاد رکھی اور بعد میں وطنی قومیت کی حمایت میں نظمیں تحریر کیں"۔ (ص ۸۴)

اس تجزیہ سے خود تجزیہ نگار کی وقت نظر اور حسن فکر کا بھی اظہار ہوتا ہے اور کون ہے جو اس سے اختلاف کر سکتا ہے، یہ سب احاطہ کرنے کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"اقبال کی طالب علمی کے دور کی شاعری کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ اس عہد میں وہ مجموعۂ اضداد تھے، زندگی ان کے لئے ابھی ایک معمہ تھی، وہ کسی پختہ یقین تک نہ پہونچے تھے، بلکہ ان کا ذہن مختلف افکار و نظریات اور جذبات کی پائداری یا ناپائیداری کو پرکھنے کے لئے ایک تجربہ گاہ تھا، اور یہ کیفیت خاصی مدت تک جاری رہی (ص ۸۵)

یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ان کی طالب علمی کا دور ان کی شاعری کی تشکیل کا عبوری دور تھا، ان کے سامنے ان کی خاندانی روایات اور دینی تعلیم کا کعبہ بھی تھا، پھر انگریزی تعلیم کے جدید اثرات کا کلیسا بھی تھا، وہ شاعری اردو میں کرتے، مگر مطالعہ میں زیادہ تر انگریزی شاعری رہتی، اسی کے ساتھ ان کا اپنا پر تخیل بھی تھا جس کے سہارے وہ پرواز کرنے کے بھی خواہاں تھے، مگر ان کے دور میں مسلمانوں کی مٹی ہوئی عظمت و شوکت کا ماتم بھی ہو رہا تھا جس سے ان کا دل روندھا ہوا بھی تھا، ان کا انداز فکر فطری طور پر حکیمانہ تھا، تعلیم یورپی

فلسفہ کی ہوئی مگر کانوں میں گھر کے ماحول کی وجہ سے تصوف اور ابن عربی کی وحدت الوجود کی آواز گونج رہی تھی، اس لئے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ان کا مجموعۂ اضداد ہونا کوئی حیرت انگیز نہیں، آگے چل کر بھی ان پر مختلف قسم کے ماحول اور رجحانات کے اثرات مترتب ہوئے مگر ان اثرات کو قبول کرنے کے ساتھ ان کو جس طرح رد کیا ہے اور پھر اپنی اصلی منزل مقصود کی طرف جس طرح گامزن ہوئے ہیں، وہی ان کی شاعری کی اصلی جان ہے، اسی کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے حسن نظر اور حسن فکر سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی یہ سوانح نگاری بڑی جاندار ہو گئی ہے۔

چھٹا باب "تدریس و تحقیق" کی سرخی کے ساتھ ہے، اس میں اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ کی ملازمت، پھر اس زمانہ میں ان کی نثری تحریروں، ان کے خاص خاص احباب اور انجمن حمایت اسلام میں سوز و گداز سے بھرے ہوئے ترنم کے ساتھ ان کی اپنی نظمیں پڑھنے کی مقبولیت کے ذکر کے بعد ان کے اس دور کی شاعری پر اہم ناقدانہ تبصرہ ہے، جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انھوں نے اس دور میں روایتی غزل گوئی سے چھٹکارا حاصل کر لیا، جس کے بعد ان کے یہاں جہاں مناظر قدرت اور حسن و جمال وغیرہ پر نظمیں ملتی ہیں، وہاں ان کے یہاں وطنی قومیت کے موضوعات بھی ہیں، اس کا ایک سبب تو ڈاکٹر جاوید اقبال یہ بتاتے ہیں کہ ان کے مزاج میں اضطراب تھا، جو بات ان کی دلچسپی کا باعث ہوئی، اس پر شعر کہہ دیتے، وطنی قومیت پر نظمیں کہنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ اس وقت تعلیم یافتہ گروہ کے سامنے یہ حقیقت تھی کہ انگریز اور یورپ کی دوسری قوموں نے وطنی قومیت کی وجہ سے ترقی کی، اس لئے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اس رو میں بہہ گیا، علامہ بھی نوجوان تھے، اس لئے ان کا بھی متاثر ہونا تعجب انگیز نہیں، ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ اس زمانہ میں ۔۔۔ شیخ المشرقی کے ہمہ اوست میں بھی غرق تھے، جس کی وجہ سے ان کے یہاں عشق مجازی، فطرت کی

مناظر کشی، حسن، ہنگامۂ کائنات اور وطنی قومیت کی گونج کے ساتھ روایتی تصوف اور اسلامیات کے بھی عناصر ہیں، پھر ایک سوال خود ہی ڈاکٹر جاوید اقبال کرتے ہیں کہ جب وہ وطنی قومیت کی مے سے سرشار اور ہمہ اوست کی وسیع المشربی میں مستغرق تھے تو اپنی شاعری میں اسلامیت کا عنصر کیوں شامل کیا، اس کے جواب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے یورپی ممالک میں صنعتی انقلاب، کلیسا اور یورپی سیاست کی باہمی آویزش، علوم و سائنس کی ترقی، تجارت اور صنعت کے پھیلاؤ، یورپی قوموں کی ملک گیری اور استعمار پسندی کی ہوس، مسلمانوں کے اخلاقی، سیاسی اور معاشی زوال اور ترکی میں مدحت پاشا، وسط ایشیا میں مفتی عالم جہان، مصر میں شیخ عبدہٗ، ہندوستان میں سرسید احمد کی اصلاحی تحریکوں، اتحاد اسلامی کے سلسلہ میں جمال الدین افغانی کے نظری اور فکری خیالات اور مولانا شبلی کے اسلامی جذبات کا جائزہ لے کر وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اس زمانہ میں جس طرح مسلم تعلیم یافتہ طبقہ میں وطنی قومیت کا جذبہ فروغ پا رہا تھا اسی طرح وہ قلبی اور ذہنی طور پر تحریک اتحاد اسلام سے بھی متاثر تھا، لیکن بظاہر ایسے اتحاد کے وجود میں آنے کے امکانات دکھائی نہ دیتے تھے بلکہ آئے دن کسی نہ کسی ملک پر مغربی استعمار کے ہاتھ مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا تھا جس کو دیکھ کر مسلمان ماتم کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے، ان کی نہ کوئی سیاسی تنظیم اور نہ قیادت تھی، اس لئے وہ بیک وقت وطنی قومیت اور عالمی اسلامی اخوت کے متضاد جذبات کے حامل بنے ہوئے تھے، اس دور میں اقبال کی شاعری مسلم معاشرہ میں اسی تضاد کی عکاسی کرتی ہے۔ (ص ۱۰۴)

اس تجزیہ میں کیسی جذباتی کسک اور مبصرانہ بصیرت ہے۔ اقبال شناسوں میں کون ہے جو اس سے اختلاف کرے گا، اور اگر کوئی اختلاف کرے گا بھی تو اقبال کے اس دور کی شاعری کو اس نقطۂ نظر سے بھی کچھ دیر تک سوچنا پڑے گا، ورنہ ان کی شاعری کا صحیح جائزہ نہ لے سکے گا۔

علامہ جب یورپ روانہ ہوئے ہیں تو اس کی تفصیل کتاب کے چھٹے باب میں آگئی ہے اور

جب وہ کیمبرج، ہائیڈل برگ اور میونخ وغیرہ میں قیام کرتے ہیں تو اس کی کہانی کتاب کے آخری یعنی ساتویں باب میں ہے، ان تمام تفصیلات کو لکھنے میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا قلم ایک افسانہ نویس اور ناول نگار کے قلم میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کو پڑھتے وقت وہی لطف ملتا ہے جو کسی اچھے ناول نگار کی تحریر میں ملا کرتا ہے، ان دونوں ابواب کی بہت سی باتیں اقبال کے اور سوانح نگاروں کی تحریروں میں نہیں ملیں گی، اور اگر ہونگی بھی تو ان کے پیش کرنے کا وہ رومانی اور کیف آگیں انداز نہیں جو اس کتاب میں ہے۔

یورپ کے قیام میں علامہ اقبال میں جو ذہنی انقلاب آیا اس کا تجزیہ بھی اس باب میں بہت اچھی طرح کیا گیا ہے، اس تجزیہ کا انداز بھی دوسرے تجزیہ نگاروں سے کچھ علٰحدہ ہے۔ اس وقت یورپ میں استعمار کی دوڑ تھی، روس کی نظر مشرق بعید کی طرف تھی، برطانیہ اور فرانس ایشیا اور افریقہ کے استحصال میں لگے ہوئے تھے، اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی فکر تھی کہ اٹلی، جرمنی اور دوسری طاقتیں ان کے اس استحصال میں شریک نہ ہوں، اس استعمار پسندی، ملک گیری اور زر اندوزی میں ان میں باہمی رقابت اور نفرت بھی تھی، مگر اسی کے ساتھ ان کی متحدہ کوشش یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کی قوت مجتمع نہ ہونے پائے، وہ سب کے سب دولتِ عثمانیہ کے استیصال کی فکر میں لگے ہوئے تھے، فرانس، مراکش کو دولت عثمانیہ سے علٰحدہ کر کے اپنے زیر نگیں کرنا چاہتا تھا، ایران کے بھی دو حصے کر دیے گئے تھے، اس کے شمالی حصہ پر روس کی برتری تھی، جنوبی حصہ پر برطانیہ حاوی ہو گیا تھا، ان واقعات سے علامہ اقبال پر یہ اثر ہوا کہ یورپ اپنی اغراض کی خاطر دنیائے اسلام کو پارہ پارہ رکھنا چاہتا ہے، اور جو اسلامی ممالک ان کے دائرۂ اثر سے باہر تھے، ان میں وطنیت کے یورپی تصور کو پھیلا کر ان کو ایک دوسرے سے علٰحدہ رکھنے میں سرگرداں رہے۔ ان مشاہدات کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ مسلمانوں میں اگر وطنیت کا

تصورِ فروغ پا گیا تو وہ بھی مغربی ریاستوں کی طرح ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے، یا آپس میں برسرِ پیکار رہ کر ایک دوسرے کے حقوق غصب کرنے لگیں گے، اس طرح وہ ختم ہو جائیں گے، اس لئے ان کو یہ خیال ہوا کہ مسلمانانِ عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اشتراکِ ایمان کے اصول پر متحد ہو کر ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کو وجود میں لائیں۔ (ص ۱۳۶) اسی کا خواب وہ اپنی شاعری میں دیکھنے لگے۔

اسی کے ساتھ یورپ کے قیام میں انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یورپی علم و ہنر کا منتہائے نظر تن تک ہے، اس میں من کی گنجائش نہیں، اس سے دماغ کی تو تربیت ہو جاتی ہے لیکن دل تشنہ رہ جاتا ہے، یہ اپنی مادہ پرستی میں عشق سے محروم ہے جو روح کے اندر حقیقی معنوں میں احترامِ آدمیت اور انسان دوستی کا جذبہ پیدا کرتا ہے، وہ اپنی مشرقی بصیرت سے اس نتیجہ پر پہونچے کہ یورپ کی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی (ص ۱۳۴)

ان کے خیالات میں یہ تلاطم پیدا ہوا تو ان میں اسلامیت کا جذبہ ابھرا اور ان کی شاعری کا رنگ بھی بدل گیا، ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ پہلے انھوں نے یورپ کے فلسفۂ عقلیت کا رد وجودی تصوف سے کیا تھا، اب ان کی نظر میں فلسفہ اور وجودی تصوف کی اہمیت جاتی رہی، وہ مقامِ عقل سے گذر کر مقامِ شوق کی طرف رواں دواں ہوئے، فلسفہ ان کے نزدیک ایک بیکار ذہنی مشق نظر آیا اور وجودی تصوف کو وہ افیون کا نشہ سمجھنے لگے تھے۔ (ص ۱۳۵)۔

یہاں پر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس وجودی تصوف سے بیزار ہو گئے، جس کی حکومت ملکوتی اور علم لاہوتی میں حرم کے درد کا درماں نہیں اور جس کی تعلیم میں ذکرِ نیم شبی، مراقبے اور سرود ہیں مگر اس سے دل یا نگاہ مسلمان نہیں بنی یا اس وجودی تصوف سے بے رغبتی ظاہر کی جس سے اسلاف کا جذبِ دروں حاصل ہوتا ہو، یا جس سے نعرۂ لا یحزنون میں شمشیر بکف

ہونے کی تڑپ پیدا ہوتی ہو، یا جس میں خودی کی گتھیاں سلجھا کر صاحبِ جنون ہونے کا جذبہ عطا ہوتا ہو، یا جس میں مئے لا الٰہ الا ہو کی مے پی کر من و تو کی تفریق مٹ جاتی ہو، یا جس سے وہ فقر حاصل ہوتا ہے جس کے ہزاروں مقام میں روحِ قرآنی بے پردہ نظر آتی ہے، یہ وہ بحث ہے جو ممکن ہے کہ اس کتاب کی دوسری جلد میں پڑھنے کو ملے۔ اور امید ہے کہ یقیناً ملے گی۔

علامہ اقبال اپنے اس ذہنی انقلاب کے بعد ۱۹۰۸ء میں یورپ سے وطن واپس آرہے تھے تو ان کا جہاز اٹلی کے جزیرہ سسلی کے قریب سے گذرا، اس وقت وہ سسلی کو تہذیب حجازی کا مزار سمجھ کر روئے (ص ۱۳۷) اور یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کے یہی آنسو آگے چل کر ان کی شاعری کا سیلِ رواں ہی بن گئے۔

اس قسم کا تجزیہ اقبال کے اور قدر شناسوں نے بھی کیا ہے، مگر ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے تجزیہ میں جو دلائل و براہین پیش کیے ہیں' یا علامہ کی شاعری کے تشکیلی دور کے جو ارتقائی مدارج اور منزلیں متعین کی ہیں وہ دراصل قابلِ غور ہیں اور اقبالیات کے لٹریچر میں قیمتی اضافے ہیں، اس باب کے ساتھ یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے، جس کو ختم کرنے کے بعد یہ خیال آیا کہ بہت دنوں کے بعد اقبالیات پر ایک اچھی کتاب مطالعہ میں آئی تھی، اس کو یہیں پر ختم نہ ہونا چاہئے تھا، اسی میں اور ابواب ہوتے، جن کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی دوسری جلد کے مطالعہ کا شوق ابھی سے تیز ہو گیا ہے، علامہ محمد اقبال کے اس نئے سوانح حیات کو غور سے پڑھنے کے ساتھ ان کے پورے کلام کا بھی مطالعہ غور سے کیا گیا تو قارئین محسوس کریں گے کہ ان کے ذہن کے بہت سے نئے دریچے کھل گئے ہیں۔

ممکن ہے کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے جویاؤں کو اس کتاب میں زبان کی کچھ خامیاں نظر آئیں، اس کے مصنف کے والد بزرگوار کی شاعری میں ایسے لوگوں کو زبان کی کمزوریاں نظر آتی تھیں، مگر انھوں نے یہ کہہ کر ان کی زبان بند کی تھی:

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض　　　　ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس کتاب کی زبان کے ناقدوں کو ڈاکٹر جاوید اقبال بھی یہی کہہ سکتے ہیں۔

اس تقریظ کو پڑھتے وقت بعض قارئین کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس میں صرف مدح وستایش ہی کے ہار گوندھے گئے ہیں، تنقیص کی کہیں چنگاریاں نہیں ہیں، مگر یہ راقم اس کو کیا کرے کہ اس کو علامہ اقبال سے عشق ہے، جب ان کی کہانی ان کے لایق فرزند کی زبانی بیان ہوئی تو اس میں اس راقم کو وہی لذت ملی جو کسی رندِ بلانوش کو شیشہ و ساغر کی محفل میں مے دوآتشہ اور سہ آتشہ کے دور میں ملتی ہے۔

جو عشق جاگداز ہو تو عشق باز کیا کریں

اقبال کامل

اس میں ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کی اردو و فارسی شاعری پر، ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ تبصرہ اور ان کے کلام کی ادبی خوبیاں اور محاسن دکھائے گئے ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، علم، سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، علامہ اقبال پر ایک جامع اور مکمل کتاب از مولانا عبد السلام ندوی

قیمت ۱۷ روپیے

مطبوعات جدیدہ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم: مرتبہ جناب مصباح الدین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت حسب توفیق، پتہ:۔ مصنف سے، ای بلاک ۴، ۱۰، سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی (پاکستان)

اردو میں ردِ قادنیت پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، مولانا ثناء اللہ امرتسری کا یہ خاص فن ہی تھا اور جناب الیاس برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" تو اس موضوع پر حرفِ آخر ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی مفید کڑی ہے، اس کی ابتدا میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اور بعد کے مختصر حالات اور آپ کی دعوت و پیغام وغیرہ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جس سے ختم نبوت لازماً ثابت ہو جاتی ہے، مصنف نے قرآن کی وہ آیتیں اور حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن میں ختم نبوت کے اسلامی عقیدہ کی صراحت موجود ہے اور ان کے علاوہ ایسی آیتیں اور حدیثیں بھی تحریر کی ہیں جن میں بظاہر تو اس کی صراحت نہیں ہے لیکن ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کا جو منصب بتایا گیا ہے اس سے یہی ظاہر ہے کہ آپ کے بعد کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے، مصنف کا یہ استدلال بھی ہے کہ گذشتہ آسمانی کتابوں اور قرآن میں ایک نبی کے بعد دوسرے نبی اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر میں مبعوث کئے جانے کا ذکر ہے لیکن آنحضرتؐ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا ادنیٰ اشارہ کہیں نہیں کیا گیا ہے، اگر واقعی ایسا ہوتا تو قرآن اس اہم اور بنیادی مسئلہ کے ذکر سے خالی نہ ہوتا، لایق مصنف نے مرزا صاحب کی زندگی کے عام حالات و واقعات بیان

کرکے دکھایا ہے کہ اس سیرت و کردار کا آدمی نبی اور رسول نہیں ہو سکتا، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قادیانیت اسلام کے خلاف ایک متوازی مذہب ہے، اور انگریزوں کی سازش سے مرزا غلام احمد مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے مامور تھے، انھوں نے پاکستان اور ملیشیا کی قومی اسمبلی اور قاضی القضاۃ ابوظبی کا یہ فیصلہ بھی تحریر کیا ہے کہ قادیانی غیر مسلم ہیں، کتاب محنت سے لکھی گئی ہے لیکن کہیں کہیں لہجہ سخت اور انداز بیان تیز ہے۔

تذکرہ خاندان عزیزی مرتبہ سید ظل الرحمن صاحب ریڈر شعبۂ علم الادویہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۷۲، قیمت ۳۰ تیس روپیے، پتہ شفاء الملک میموریل کمیٹی، دودھ پور، علی گڑھ،

مسلمانوں نے دوسرے علوم و فنون کی طرح فن طب کو بھی بہت ترقی دی اور اس کو چار چاند لگایا، ہندوستانی مسلمانوں کے کارنامے علم الادیان (دینی علوم) کی طرح علم الابدان (طب) میں کسی اسلامی ملک سے کم نہیں، طب جدید کی ترقی سے پہلے ہندوستان میں سب سے بہتر، مقبول، ارزاں اور سہل طریقۂ علاج یہی تھا، آخری دور میں دلی اور لکھنؤ زبان و ادب کی طرح طب و حکمت کے بھی اہم مرکز سمجھے جاتے تھے، لکھنؤ میں بھی جھوائی ٹولے کا خاندان بہت ممتاز تھا، اس کی بدولت لکھنؤ کو ایک مستقل طبی اسکول کا درجہ ملا، اور یہاں کے صاحب کمالات اور مجتہد الفن اطبا کی حذاقت اور مسیحائی کے ڈنکے پورے ملک میں بجتے تھے، زیر نظر کتاب میں جھوائی ٹولہ کے ان چوالیس کامل الفن اور جید اطبا کے سوانح و حالات قلمبند کئے گئے ہیں، حکیم عبد العزیز اس خاندان کے گل سر سبد اور تکمیل الطب کالج کے بانی تھے، انہی کے نام نیک کی نسبت سے یہ خانوادہ "خاندان عزیزی" کے نام سے موسوم ہوا، مصنف نے یہ تذکرہ ان کے جد امجد حکیم محمد یعقوب سے شروع کیا ہے، کیونکہ اس خاندان میں سب سے پہلے ان ہی سے اس فن کی ابتدا ہوئی تھی، مصنف نے تمام طبیبوں کے طبی امتیازات و اجتہادات، فن طب میں

ان کی علمی، تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں، طبی مسائل میں اہل دلی سے ان کا اختلاف اور دوسرے علمی و ادبی اشتغال کا بھی ذکر کیا ہے، اور ان کی حذاقت و مہارت فن دکھانے کے لئے ان کے مختلف نسخے بھی نقل کئے ہیں، درس و تدریس بھی خاندان عزیزی کا طرۂ امتیاز تھا، اس کی پوری تفصیل بھی دی ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب پونے دو سو برس کی طبی تاریخ ہے، ہندوستان کی طبی تاریخ اور یہاں کے اطبا کے حالات میں کم کتابیں لکھی گئی ہیں، لائق مصنف کا یہ خاص موضوع ہے، اس سے پہلے بھی وہ اس موضوع پر کئی کتابیں مرتب کر چکے ہیں، جن میں سے چند چھپ گئی ہیں، مصنف کو جھوائی ٹولہ کی آخری علمی و طبی یادگار شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب سے استفادہ کرنے کا موقع بھی مل چکا ہے، اس لئے انھوں نے یہ تذکرہ بہت شوق و محنت سے لکھ کر اس ممتاز طبی خانوادہ کا نام نیک ضائع ہونے سے بچا لیا، وہ ندوی بھی ہیں اس لئے ان کو تالیف و تصنیف کا اچھا سلیقہ ہے جس کا نمونہ یہ کتاب بھی ہے،

۱۔ ہندوستان میں عربی علوم و فنون کے ممتاز علماء اور انکی علمی خدمات
۲۔ تذکرہ حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندوی،
۳۔ تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ،

مرتبہ ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۵۶ و ۱۶۴ و ۱۱۲ قیمت ۱۵ روپیے و ۱۰ روپیے و ۳ روپیے، پتہ مکتبہ طیبہ ۲۰/۲۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ

ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی مولانا محمد اویس نگرامی ندوی مرحوم کے ہونہار فرزند ہیں، ان کو علم و فن کا موروثی ذوق ہے، یہ تینوں کتابیں انھوں نے بڑے سلیقہ سے مرتب کی ہیں، پہلی کتاب پر ان کو لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے اس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کے ہندوستانی علماء و مصنفین نے عربی زبان کی جو خدمات

کی ہیں، ان کا چار ابواب میں جائزہ لیا ہے، پہلے باب کی حیثیت تمہید کی ہے، اس میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے عربی علوم و فنون سے متعلق کاموں کا اجمالی ذکر ہے، آخری تین ابواب میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، طبقات، سیر، تذکرہ، منطق، فلسفہ، ادب اور شاعری سے متعلق ہندوستان کی عربی تصنیفات کا ذکر اور ان کے مصنفین کے مختصر حالات دیے گئے ہیں، اس قسم کے جائزوں میں امکانی کوشش کے بعد بھی بعض نام چھوٹ ہی جاتے ہیں مگر تعجب ہے کہ لائق مصنف نے علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی کو نظر انداز کر دیا ہے، مولانا محمد اسلم جیراجپوری کا ذکر بھی رہ گیا ہے حالانکہ ان کی کتاب "الوراثۃ فی الاسلام" یہ ایک زمانہ میں بڑی رد و کد ہو چکی ہے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی پابندیوں کی وجہ سے مصنف کے لئے اس میں مزید تفصیل کی گنجائش نہ رہی ہوگی لیکن کتابی صورت دیتے وقت ان کو زیادہ پھیلا کر لکھنا چاہئے تھا، تاہم یہ جس صورت میں بھی شائع ہوئی ہے فائدہ سے خالی نہیں ہے، مگر غفلت یا عجلت کی وجہ سے اس میں کتابت و طباعت کی بیشمار غلطیاں رہ گئی ہیں۔

دوسری کتاب مصنف کے والد بزرگوار مولانا محمد اویس ندوی مرحوم کا تذکرہ ہے، اس میں وہ سب مضامین اور تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں جو مولانا کی وفات کے بعد ان کے دوستوں اور عزیزوں نے تحریر کئے تھے، یہ کئی حصوں پر مشتمل ہے، پہلے دونوں حصے خود لائق مرتب کے قلم سے ہیں، ابتدائی حصہ میں نگرام کے اس علمی و دینی خانوادہ کے متعلق معلومات درج ہیں، جس سے مولانا اویس مرحوم کا تعلق تھا، دوسرے حصہ میں مولانا کے سوانح حیات اور علمی خدمات کا ذکر ہے، تیسرا حصہ ان تاثراتی مضامین پر مشتمل ہے جو ان کے احباب و تلامذہ نے قلمبند کئے تھے، اس حصہ میں مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کا مختصر اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا طویل مضمون بہت مؤثر ہے، چوتھے حصہ میں اخباروں اور رسالوں کے شذرے اور آخری حصہ میں اہل تعلق کے تعزیتی خطوط دیے گئے ہیں، ان سے مولانا کی سیرت و شخصیت، ان کے علمی شغف، خوش طبعی اور نفاست وغیرہ مختلف پہلو سامنے آ گئے ہیں، تیسرا کتابچہ صلحاء و اخیار کے دلآویز حالات و واقعات کا سبق آموز مجموعہ ہے۔

"ض"